اُردو

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر

عبدالحق بی۔اے (علیگ)

آنریری سکریٹری

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری ' اپریل ' جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے --

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے - حجم کم از کم ڈیرہ سو صفحے ہوتا ہے ---

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے سکۂ انگریزی (مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) ---

۴ - تمام خط و کتابت مولوی عبدالحق صاحب بی اے ' آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چا .

(باہتمام محمد صدیق حسن منیجر انجمن اردو پریس ' اردو باغ اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا)

اردو

جلد ۱۵	جولائی سنہ ۱۹۳۵ ع	حصہ ۵۹

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

دکن بک اینڈ اسٹیشنری مارٹ

[illegible]

اورنگ آباد (دکن)

فہرستِ مضامین

بابت جولائی سنہ 1935ع

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	ادب اور زندگی	اختر حسین صاحب رائے پوری	۴۳۹
۲	ٹیگور کے ادبی مضامین	پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا النکار	۵۱۹
۳	سخنوران ایران در عصر حاضر	جناب آغا محمد تقی "پارسا" شیرازی	۵۲۸
۴	سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ	اڈیٹر	۵۴۳
۵	شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا و ترقی	جناب شیخ چاند صاحب ایم - اے ایل ایل - بی	۵۵۹
۶	گجرات کا باکمال شاعر اردشیرخبردار	اختر حسین صاحب رائے پوری	۵۶۹
۷	بادۂ کہن (غزلیات اشرف)	(چ)	۵۸۴
۸	تبصرے	اڈیٹر و دیگر حضرات	۵۹۱

ادب اور زندگی

از

(از جناب اختر حسین صاحب رائے پوری بی - اے)

ماضی کو سمجھہ ' مستقبل کا پیغام دنیا کو سنا — میرے ضمیر سے
ادب کا یہ تقاضا تھا - ماضی اور استقبال کو میں سمجھا لیکن
' آج کی ' دنیا میں میرے لئے جگہ نہیں - اب ادب کا یہ تقاضا
ہے کہ میں اپنی زندگی ختم کردوں " —

(روسی ادب جدید کے علم بردار ' میکوسکی ' کا آخری خط)

ادب کیا ہے ؟ ادب براے ادب یا ادب براے زندگی ؟ ادب کے صد کیا ہیں ؟ — یہ سوالات اتنے ہی پرانے ہیں جتنی علم ادب کی گی - ارباب حل و عقد نے اس مبحث پر بڑے بڑے دفتر سیاہ کردئے اوراب اس موضوع پر از سرنو کچھہ کہنا تحصیل حاصل سمجھا جاے گا - اگر مجھے اس کا احساس نہ ہوتا کہ آج زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھل رہی ہے سماج ایک دور تغیر سے گزر رہا ہے اور انسانیت ارتقاء بالضد (Dialectics) کے دوراہے پر آکر ہر ایمان دار ادیب سے پوچھہ رہی ہے کہ —

" دونوں میں سے کس کے موئید ہو — پیشہ ور گوشہ نشینی
یا عوام سے یگانگی ؟ جنگلوں اور پہاڑوں کی چاہت یا انسان
کی خدمت ؟ غیر ذمہ وارانہ خودسری یا خیالات کا ارتباط

قدرت یا ضمیر ؟ جبر یا اختیار ؟ تقدیر یا تدبیر ؟ قدرت کی اطاعت یا قدرت پر حکومت ؟ آرٹ آرٹ کے لئے یا آرٹ انسان کے لئے ؟ زمین یا آسمان ؟ دوئی یا یگانگی ؟ — ان میں سے ایک پر زندہ درگور دنیائے قدیم کا انحصار ہے اور دوسرے پر مستقبل کا دار و مدار — تم دونوں میں سے کس کے حامی ہو ؟"

(زمانۂ حال کا ادب از پی - سی - کوگن)

اگر یہ مرحلہ در پیش نہ ہوتا اور ادیب سماج کا ایک فرد نہیں بلکہ کوئی بن باسی ہوتا تو مضمون کی نوعیت مجھے قلم اُٹھانے کی اجازت نہ دیتی - مگر چونکہ معاملہ اس کے برعکس ہے اور حقائق زندگی و اشارات ادب کی خلیج اس ملک میں وسیع تر ہوتی جاتی ہے اچھا ہو کہ یہ مسئلہ پھر چھیڑا جائے اور یاران نکتہ داں کے آگے یہ اہم سوال پیش کیا جائے —

مضمون کے پہلے حصے میں دکھایا جائے گا کہ تخلیق ادب معاشی زندگی کا ایک شعبہ ہے اور ادب زندگی کا پروردہ اور آئینہ دار ہے - پھر جب یہ تصفیہ ہو چکے گا کہ زندگی اور ادب کے مقاصد ایک ہیں تو روح مقصد کی وضاحت کے لئے ہم ہندوستانی ادب کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کریں گے اور دیکھیں گے کہ ہمارے ادب نے اپنے فرائض کی تکمیل کس حد تک کی ہے - میرا خیال ہے کہ ہندوستان پر برطانیہ کی فتح سامنتی (Feudal) تمدن پر حرفتی (Industrial) تمدن کی فتح تھی اور دیسی سماج کی سامنتی بنیاد جو پلاسی کی جنگ سے پہلے متزلزل ہو رہی تھی ہنگامۂ سنہ ۵۷ ع کے صدمے سے اس کا شیرازہ تیزی سے منتشر ہونے لگا - ہنگامۂ سنہ ۵۷ ع ہمارے سماج کی منزل ارتقا میں ایک حد فاصل قائم کرتا ہے - اس زاویۂ نگاہ کی روشنی میں ادب ہند کے بھی دو دور مقرر کئے جا سکتے ہیں - ایک وہ

جو اس زمانہ کے لگ بھگ انحطاط پذیر ہونے لگتا اور دوسرا وہ جو اس کے بعد رفتہ رفتہ آنکھیں کھولنے لگتا ہے - آسانی کے لئے ہم انھیں قدیم اور جدید ادب کہینگے - یہ تجزیہ خالصاً معاشی ہے - برسبیل تذکرہ مجھے یہ کہنے میں تکلف نہیں کہ غزل گوئی کا زوال سامنتی تہذیب کی تباہی کا پرتو اور نظم کی اٹھان سماج کے بند پانی کی روانی کی علامت ہے جو ہنوز رسوم و اوہام کی کشمکش میں مبتلا ہے —

کسی یونانی حکیم کا قول ہے کہ خیالات کی اینٹوں کو جذبات کے چونے سے ہی جوڑا جاسکتا ہے - انسان خیالات و جذبات کا مجموعہ ہے - سائنس خیالات میں ربط و نظم قائم کرتا اور ان کی تراش خراش کرتا ہے - آرٹ جذبات کو بناتا ' سنوارتا اور نقش و نگار اشارات و الفاظ کے ذریعے ان کی ترجمانی کرتا ہے - ادیب اپنی جذباتی کیفیات کو الفاظ کا جامہ پہناتا اور اپنی افتاد طبیعت کے مطابق اس کی کاٹ چھانٹ کرتا ہے - مدعا یہ ہے کہ ادب جذبات کی بولتی ہوئی تصویر ہے - دیکھنا یہ ہے کہ جذبات کی ترتیب و تکوین کس طرح ہوتی ہے - ظاہر ہے کہ ہر جذبہ گرد و پیش کا مطیع ہے اور حالات کے مطابق جذبات بدلتے رہتے ہیں - فضا کا ہیر پھیر کبھی آدمی کو رلاتا اور کبھی ہنساتا ' کبھی آزردہ اور کبھی غضبناک بنا دیتا ہے - مثلاً ' موت ' اور ' بھوک ' کے مسائل ہمیشہ آدمی کو خون کے آنسو رلاتے رہے ہیں - ایک کے لئے قدرت دوسرے کے لئے سماج ذمہ وار ہے - اگر یہ دو مصیبتیں نہ ہوں تو ہمارے ادیب کی حزنیت بہت کم ہوجاے گی اور پھر فراق یار کے علاوہ بہت کم چیزیں اسے رنج دیا کریں گی- اگر سماج اور قدرت کے نظام میں ایسی تبدیلی ہو کہ یہ فضا بدل جاے تو ایسے جذبات بھی پیدا نہ ہوں گے —

اب تک ہمارے تنقید نگاروں نے یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ ادیب نے جذبات کو کس طرح ظاہر کیا ہے - (Form) کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے - لیکن اگر یہ سمجھہ لیا جاے کہ ادیب جن جذبات کو آشکار کر رہا ہے وہ الہامی نہیں بلکہ ماحولی ہیں تو یہ سوال زیادہ اہم ہو جاتا ہے کہ ان جذبات کو کون اور کیوں ظاہر کر رہا ہے - ادیب سماج کے مطالبات اور اپنے گرد و پیش سے ہر انسان کی طرح متاثر ہوتا ہے - وہ جس زمانے میں جس تہذیب و تمدن کی گود میں پرورش پاے گا ' جن لوگوں کے ساتھہ رہے گا اور جن روایات و خیالات کا حامل ہوگا — وہ یقیناً اس کے جذبات کو رنگ روپ دیں گے ' اس لیے میری ناچیز راے میں کسی ادیب کی روح کو سمجھنے کے لئے اس فضا کو سمجھنا زیادہ ضروری ہے جس میں اُس نے پرورش پائی - جب تک اس زمانے کی زندگی نہ سمجھی جاے یہ سمجھہ میں نہیں آسکتا کہ ادیب نے یہی کیوں کہا ' اس کے خلاف کیوں نہیں کہا - اس لئے کہ ادیب اپنے جذبات کی نہیں اپنی فضا کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے - اس کی زبان سے اجتماعی انسان بول رہا ہے —

فرض کیجئے کہ کسی شہر میں ایک کارخانہ بنایا جاتا ہے - اس کی تعمیر کی ظاہری صورت یہی ہے کہ ایک امیر نے سرمایہ لگایا انجنیر نے نقشہ بنایا اور مزدوروں کی محنت نے سرمایہ کھڑا کر دیا - لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ جب تک اقتصادی ضروریات کا مطالبہ نہ ہوتا کہ کارخانہ بنایا جاے اس وقت تک اس کا خیال بھی کسی کے ذہن میں نہ آتا - کارخانے کی وجہ تعمیر کو سمجھنے کے لئے اس زمانہ کی حالیات پر غور کرنا چاہئے نہ کہ اس سیٹھہ کی تھیلی کی لمبائی اور انجنیر کے نقشہ کی

ستھرائی پر۔ اسی طرح کسی زمانے کے ادب کا غائر مطالعه مقتضی ھے اُس زمانے کے حالات کو سمجھنے کا، که اُن مخصوص جذبات کو اُن مخصوص حالات نے ھی پیدا کیا تھا۔ سنسکرت شاعری جن جذبات کی حامل ھے وہ قدیم ھند کے اساطیر (Myths) کے پس منظر میں ھی سمجھ میں آ سکتے ھیں۔ سماج اپنے عہد طفلی میں اپسراؤں* اور راکششوں کے افسانے سن اور سمجھ سکتا ھے لیکن اب اپنے زمانۂ پیری میں وہ ان رنگین خوابوں کا تانا بانا کیوں کر بُن سکتا ھے جب که اپسرا کی جگه سینما کی طوائف اور راکشس کا نمبر روبت† (Robot) نے چھین لیا ھے اب شمع پر پروانے بھی کم آتے ھیں که آگ کی جگه بجلی آ گئی اور خرمن پر برق بھی کم گرتی ھے که اس پر برقی سلاخ نصب کر دی گئی ھے! صحراؤں میں محمل کا پتا نہیں که موٹر چلنے لگے اور ڈولیوں کا رواج بھی کم ھو چلا که کہاروں کے کاندھے چھل گئے۔ زمانے کے رد و بدل نے سنسکرت شاعری کے پر نوچ لیے اور احساسات و جذبات کی تبدیلی کا یه مطالبه ھوا که ھندوستانی ادب کا دھارا اپنے بھاؤ کے لیے نیا میدان تلاش کرے —

اب یه دیکھنا ھے که ادب کے فرائض کیا ھیں۔ میرا مطلب اُن کے مقصد سے نہیں ھے۔ طالسطائی کا یه مقوله بالکل صحیح ھے که آرٹ جذبات انسان کو متاثر کرنے کا ایک ذریعه ھے مغنی ایک یاس انگیز نغمه چھیڑتا ھے اور سننے والے بلا امتیاز اندوہ و الم سے چیخ اُٹھتے ھیں۔ شاعر طرب و نشاط کا گیت سناتا ھے تو سننے والے شادماں ھو جاتے ھیں۔ دستوویسکی جب "گناہ اور سزا" میں ایک روح کی کشمکش دکھاتا ھے تو ناظر کی روح میں گتھی سی پڑ جاتی ھے۔ ادیب کے کمال کا ایک معیار

* اپسرا — حور کا ھندو تصور۔ † روبت — مصنوعی انسان۔

بھی ہو سکتا ھے کہ اپنے جذبات سے وہ دوسروں کو کس حد تک متاثر کر سکا- اُس کی عبارت زمان و مکاں کے امتیاز سے جتنی بالا تر ہوگی ' اس کا آرٹ اتنا ھی دیرپا اور مستحسن سمجھا جاے گا- مگر وہ اپنے ماحول سے جدا نہیں ہو سکتا اپنے ماحول کے تاثرات کو بیان کرتا ھے یعنی اپنے ماحول سے لوگوں کو متاثر کرتا ھے- جب تلسی داس ایک زن مرید باپ کی اطاعت کو بیٹے کا دین و مذھب بتلاتا ھے تو اُس کے قلم سے اُس زمانے کی تہذیب بولتی ھے جس میں بیٹے کی حیثیت باپ کی غیر منقولہ جائداد سے زیادہ نہ تھی - آج جب ھر بیٹا اپنی انفرادیت کو شفقت پدری سے زیادہ قیمتی سمجھہ رھا ھے تو اس قسم کی تعلیم رجعت اور قدامت سے تعبیر کی جاےگی-

یہاں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ھے کہ آرٹ کا مقصد کیا ھے:

' ادب براے ادب ' کے علم برداروں کا خیال ھے کہ روح اور خدا کی طرح ادب بھی کوئی ما فوق الفامین (Super Organic) شئے ھے اور جس طرح حسن و حقیقت کو عام معیار پر نہیں جانچا جا سکتا اسی طرح ادب سے سرور و حظ اسی حالت میں حاصل کیا جا سکتا ھے کہ اسے سماج کی پابندیوں سے الگ رکھا جاے- جمالیاتی نقطۂ نظر ' جس کے موئید ھیگل ' شوپین ھوور فلاسفے اور بہت سے انگریز ادبا اور مفکرین ھیں ' آرٹ کا مقصد تلاش حسن کو قرار دیتے ھیں- اخلاقی نقطۂ خیال جس کی تشریح طالسطائی نے کی ' آرٹ کو نیکی کا آئینہ دار قرار دیتا ھے- معاشی اور مادی نقطۂ نگاہ سے یہ دونوں معیار مبہم اور ادھورے ھیں- اگر یہ صحیح ھے کہ ادیب انسان ھے اور ھر انسان کی طرح ماحول متاثر ہوتا ھے اور اگر یہ حقیقت ھے کہ ادب نگاری بھی ایک قسم کا سماجی عمل ھے اور انسانیت اس سے اثر اندوز ہوتی ھے- تو ادب اور انسانیت کے مقاصد ایک ھیں-

ادب زندگی کا ایک شعبہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ مادی سرزمین میں جذبات انسانی کی تشریح و تفسیر کرتے ہوئے وہ روح القدس بننے اور عرش پر جا بیٹھنے کا دعویٰ کرے- زندگی کا ڈھانچا مکمل اور واحد ہے - اس میں سائنس آرٹ اور فلسفہ کے مختلف خانے نہیں ہیں کہ جس کا جی چاہے کہہ دے کہ مجھے زندگی سے کیا غرض' میں آپ اپنے لئے زندہ ہوں! اور چیزوں کی طرح فن و ادب بھی زندگی کے پروردہ اور خادم ہیں- ادب ماضی و حال اور حال و مستقبل میں رشتہ جوڑتا ہے - رنگ و نسل اور ملک و قوم کی بندشوں کو توڑ کر وہ بنی نوع انسان کو وحدت کا پیغام سناتا ہے - کوئی وجہ نہیں کہ اتنے اہم معاشی فریضے کو ایک فن کار اپنی ذاتی ملکیت سمجھے اور اس کا یہ دعویٰ تسلیم کرلیا جائے- حسن کیا ہے جس کی تلاش میں مدعیانِ ادب برائے ادب مدتوں سے سرگرداں ہیں ؟ حسن کی تعریف ناممکن سی ہے - والتیر نے اپنی مشہور تصنیف (Dictionaire de Philosophie) میں ان لوگوں کا بڑا مذاق اُڑایا ہے جو حسن کا کوئی معیار قایم کرنا چاہتے ہیں- وہ لکھتا ہے کہ مینڈکی کو بھی اپنی نرم اور چمک دار جلد پر خوبصورتی کا دعویٰ ہے اور ایک حبشی حسینہ کے چہرے اور موٹے ہونٹوں پر بھی عاشقوں کا گروہ دل و جان قربان کرتا ہے - جرمنی کے کلاسکل فلاسفروں کے نزدیک یہ وہ چیز نہیں ہے جو آدمی کو خوش کرتی ہے - اس کے یہ معنی ہوے کہ ادب کا مقصدِ اُولیٰ تفریح طبع ہے اور چونکہ دعویٰ یہ بھی ہے کہ آرٹ زندگی کا اہم ترین شعبہ ہے لہذا تفریح زندگی کی معراج ہوئی! پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی جس چیز سے مسرور ہوتا ہے وہ دوسرے کے لیے اجیرن ہے - زندگی اور ادب کا یہ نظریہ اس قدر بے معنی ہے کہ اس پر کچھہ لکھنا فضول ہے - پھر کیا آرٹ کا مقصد تلاش حق ہے ؟ حقیقت

کیا ہے! کیا حقیقت کی کوئی قطعی اور آخری تعریف ہو سکتی ہے جو سب کے لیے قابل قبول ہو؟ جو چیز ایک کے لیے اچھی ہے دوسرے کے لیے بری - امیر کے لیے جو حق ہے وہ غریب کے لیے ناحق ہے - پھر ادب کس حقیقت کا جویا ہے -

میں پھر اپنے اسی جملے کو دہراتا ہوں کہ زندگی کے مقاصد سے ہٹ کر ادب نہ اپنی منزل تلاش کر سکتا ہے اور نہ یہ ممکن ہے - زندگی کی روانی اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کرتی ہے' عام اس سے کہ وہ اپنے آپ کو رموز حیات کا محرم اور حسن و عشق کا پروردگار کہتا رہے - ایک انسان اور ایک ادیب کے فرایض و مقاصد یکساں اور مشترک ہیں - فرق صرف اتنا ہے کہ ایک اپنے ماحول کی ترجمانی کرتا اور دوسرا اس سے متاثر ہوتا ہے - یہ صحیح ہے کہ دنیاے ادب میں ایسی بیسیوں مثالیں ملیں گی کہ ادیب اپنے ماحول سے بے خبر اور آزاد ہوکر آگے یا پیچھے جانا چاہتا ہے - اپنے موقع پر ایسی واردات کے اسباب پر بھی غور کیا جاے گا اور ہم دیکھیں گے کہ یہ حالات کا ہی رد عمل تھا' کوئی الہامی کیفیت نہ تھی —

اب تک ہم جن نتائج پر پہنچے وہ یہ ہیں —

(۱) ادب زندگی کا ایک شعبہ اور اپنے ماحول کا ترجمان ہے —

(۲) زندگی اور ادب کے مقاصد ایک ہیں —

زندگی کے مقاصد کو سمجھنے کے لیے سرسری طور پر ہمیں سماج کی بنیاد کا جائیزہ لینا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ سماج کیوں بنتا اور بگڑتا ہے اور یہ تبدیلیاں اسے کس منزل کی طرف لے جا رہی ہیں -

سماج ایسے افراد کا مجموعہ ہے جو اشتراک عمل کے لیے یک جا ہوتے ہیں - اشتراک اور تعاون کے لیے ان افراد کا مقصد یکساں ہونا ناگزیر ہے - ہر فرد کی مادی ضروریات کم و بیش ایک سی ہوتی ہیں اور سماج کی

ابتدا اس غرض سے ہوتی ہے کہ ضروریات زندگی کے حصول و تقسیم میں آسانی ہے - یعنی سماج کا سنگ بنیاد انسان کی مالی ضروریات کی پیداوار اور تقسیم پر ہے اور افراد کا رشتۂ باہمی اس پیچ و خم کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے - سماج کی ترقی سے مراد یہ ہے کہ اس کے افراد کا رشتہ مستحکم ہوتا جاتا ہے یعنی ضروریات زندگی کی بہم رسانی آسان ہوتی جاتی ہے جس سے انہیں اپنی خواہشوں کی تکمیل کا موقع ملتا ہے - پیداوار کے ذرائع جتنے وسیع اور کارآمد ہوں گے اور مال کا طریقۂ تقسیم اکثریت کے لیے جتنا قابل قبول ہوگا اسی اعتبار سے نظام معاشی کی عمر دراز ہوگی - سماج کے ارتقا سے مراد دراصل پیداوار کے انہیں ذرائع کے ارتقا سے ہے - دور وحشت سے گزر کر انسان دور حرفت میں کیسے پہنچ گیا ، اسے سمجھنے کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ کلہاڑی نے ٹریکٹر کی شکل کس طرح اختیار کرلی اور نیزہ مشین گن کیسے بن گیا - پیداوار کے ذرائع دو حصوں میں منقسم کئے جاسکتے ہیں - ایک طرف تو قدرتی ذرائع و عناصر ہیں جنہیں حسب ضرورت کارآمد بنانا ہے اور دوسری طرف وہ انسانی محنت ہے جو یہ فرض انجام دیتی ہے - زمین کان اور خام اشیا کی دوسری قدرتی رسد گاہیں جیسی پہلے تھیں ویسی ہی اب بھی ہیں - ان میں فرق نہیں آتا - سماج کا ارتقا و تغیر محتاج ہے انسانی محنت کا ' جو ان اشیا کو قابل استعمال بناتی ہے - جس کھیت میں کاشتکاری کے فرسودہ طریقوں سے دس من غلہ پیدا ہوتا تھا آج وہاں مشینوں سے سیکڑوں من اناج پیدا ہوتا ہے - یہ پیداوار کے ذرائع کی ترقی ہے جسے ہم سماج کی ترقی سے تعبیر کرتے ہیں - پہلے یہ کہا جا چکا ہے کہ نظام معاشی کا بنیادی پتھر ' ضروریات زندگی کی پیداوار پر رکھا گیا ہے اور سماج اسی

وقت تک قایم ھے جب تک اس کے افراد کا رشتۂ باھمی مستحکم ھے جس کی ضمانت ھر فرد کی ضروریات کی تکمیل ھے - اس سے یہ لازم آیا کہ پیدا وار اور تقسیم کے طریقے ایسے ھونے چاھئیں کہ ھر فرد اپنی بساط کے مطابق محنت کرکے اپنی ضروریات حاصل کر سکے - یعنی پیداوار اور تقسیم کا ارتباط رشتۂ افراد کے استحکام کا ضامن ھو سکے - ھر فلسفۂ زندگی کا منشا یہی ھے کہ ھر فرد بشر کو روحانی ' ذھنی و جسمانی نشو و نما کا موقع مل سکے - مگر انسان کا مادّی وجود اس کا مقتضی ھے کہ سب سے پہلے اس کی جسمانی ضروریات کا انتظام ھو - سرمایہ دولت یا امارت سے وھی لوگ بہرہ مند ھوتے ھیں جو پیداوار کے ذرائع پر کسی نہ کسی طرح قابض ھوتے ھیں - غریب و فقیر وہ لوگ ھیں جو ان کی ملکیت سے محروم ھیں - اگر کبھی ایسا ھو سکے کہ پیداوار کے ذرائع پر کوئی ایک طبقہ نہیں بلکہ پورا سماج قابض ھو اور مال کی تقسیم اس طرح ھو کہ ھر محنت کش فکر روزگار سے آزاد ھو جاے اور آئندہ نسل کی تربیت و پرورش کی کفالت و تحفظ سماج کر سکے ' تو یہ سماج کی مادی ترقی کی انتہا ھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ذھنی و تمدن اعتبار سے بھی انسانیت کو مرتبۂ بلند کی طرف لے جا سکے گا ' اور اس وقت روح الاجتماع خدا وند بن جاے گی اور کثرت و وحدت میں کوئی تنازع نہ رھے گا - یہ زندگی کا مقصد اولی ھے اور اس کا تقاضا ھے کہ اس کا ھر شعبہ اس کے حصول کے لئے کوشاں ھو —

اسی چیز کو مدنظر رکھ کر ادب جدید کا پیغمبر ' میکسم گورکی ' کہتا ھے : ادب انسانیت کا نقاد ھے - وہ اس کی کجروی کو ظاھر کرتا اور اس کی خامکاریوں کو بے نقاب کرتا ھے - اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ھے کہ انسان کی حیات مستعار کو دائم و قائم بناے - ادب کی بیکاں

اور تڑپ اس لئے ہے کہ آدمی کو سمجھائے کہ وہ حالات کا غلام نہیں ہے بلکہ حالات اس کے غلام ہیں - وہ آدمی کو بتلانا چاہتا ہے کہ وہ آپ اپنی زندگی کا مالک ہے اور اسے جس روش پر چاہے لے جا سکتا ہے - اس لحاظ سے ادب تغیر پسند قدامت شکن اور دور جدید کا پیش رو ہے - "

ادب زندگی کے اس سوال کا جواب ہے کہ انسان کس سے محبت اور کس سے نفرت کرے اور کس طرح زندہ رہے - یہ سچ ہے کہ تدریسیت سے اسے کوئی واسطہ نہیں - روگی انسانیت کو وہ پند و نصیحت کی کڑوی دوا نہیں پلاتا بلکہ ہلکے اور میٹھے سروں سے اس کی عیادت کرتا ہے - اس میں شبہ نہیں کہ ادب کے ماخذ ماضی و حال نہیں لیکن وہ مستقبل کا جویا ہے - وہ پیچھے یا دائیں بائیں طرف اس غرض سے دیکھہ لیتا ہے کہ منزل حیات کے نشیب و فراز کو دیکھہ سکے اور آگے بڑھ سکے - تاریخ کے محاذ میں اس کی جگہ صف آخر میں نہیں بلکہ پیش پیش ہے - لہذا ادب کا یہ مقصد ہے کہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے بالاتر ہوتے ہوئے بھی اپنے گرد و پیش کا آئینہ دار ہوتا کہ اس کے حسن و قبح سے آگاہ ہوکر انسانیت ترقی کے زینوں پر گامزن ہو - علم اور ادب میں وہی فرق ہے جو استاد کی دھمکیوں اور ماں کی لوریوں میں - ادب وہ استاد ہے جو کہانیوں اور گیتوں میں انسانیت کو رموز حیات سمجھاتا ہے - ادب کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ ان جذبات کی ترجمانی کرے جو دنیا کو ترقی کی راہ دکھائیں ان جذبات پر نفرین کرے جو دنیا کو آگے نہیں بڑھنے دیتے اور پھر وہ انداز بیان اختیار کرے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھہ میں آسکے - کیونکہ بہر حال زندگی کا مقصد یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا زیادہ سے زیادہ بھلا ہوسکے —

ادب هند کا ایک خاکه پیش کرکے هم یه دیکھینگے که وہ کہاں تک مذکورہ مقصد کا حاصل رہا هے کیا وہ زندگی کے حقائق اور مقاصد کی ترجمانی کرتا رہا هے اور کیا وہ انسانیت کا مصلح اور پیشوا کہا جاسکتا هے - ابھی صرف یه دیکھنا هے که همارے ادیب عموماً کس ماحول میں رهتے آے هیں کیونکه همارے تجزیه کے مطابق اُن کے جذبات کی شکل اسی ماحول میں هوئی - کیا یه ماحول اور یه جذبات زندگی کے لئے چراغ راہ بن سکتے هیں ؟ اب زندگی کو کس طرف جانا چاهئے اور همارا ادب کس طرف جارہا هے ؟

زمانۂ قدیم اور عہد وسطیٰ بلکه گزشته صدی کے اواخر تک علم وادب پر دو قسم کے لوگوں کا اجارہ رہا هے - ایک وہ جو بیراگی یا صوفی تھے اور دوسرے وہ جو طبقۂ امرا سے تعلق رکھتے تھے اور زندگی کی تگ ودو سے ان کا کوئی تعلق نه تھا - آشرموں یا حجروں میں اور درباروں یا امیروں کی ڈیوڑھیوں میں پڑے هوے یه عالم اور ادیب زندگی کے مسائل کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کیا کرتے تھے - وہ ایک ایسے ماحول میں رهتے تھے جو یا تو زندگی سے دور تھا اور یا جھوٹی زندگی کا عکاس تھا - سوچیئے که دربار یا آشرم میں رہ کر انسان کِن جذبات کی ترجمانی کن کی زبان میں کرے گا - ایک محدود دائرے میں رہ کر جہاں ایک سے لوگ ایک قسم کی زندگی بسر کرتے هیں ' جہاں حزنیت یا منافقت کا دور دورہ هے — وهاں کسی ادیب کی حالت کیا هوگی ! اس لحاظ سے همارے ادب قدیم کے تین نقائص اتنے نمایاں هیں که حاشا تشریح طلب نہیں :

۱ - موضوعات ادب بہت هی فرسودہ اور محدود هیں -

۲ - لطف بیان اور زیب داستاں پر معنی و مقصد قربان کئے جاتے هیں -

۳ - ادب کو لوگ پیشہ کی حیثیت سے اختیار کرتے ہیں -

تاریخ بتاتی ہے کہ اس ملک کا ادب ہر دور میں طبقۂ امرا کا خادم اور منت پذیر رہا ہے - کچھہ صوفی شاعر اور عہد وسطی کی ' بھکتی تحریک ' کے علم بردار ادیب ایسے ضرور ہوے ہیں جو امیروں کے دست نگر نہ تھے لیکن ان میں سے اکثر دنیا سے بیزار اور بے نیاز تھے جس کی جھلک ان کے کلام میں موجود ہے - کبیر داس اور نظیر اکبرآبادی جیسے شاعر خال خال ہی ہوے ہیں جو گھوم پھر کر آپ اپنی روٹیاں کماتے ' اور زندگی کو کوچۂ یار میں رہ کر نہیں بلکہ قدرت کے نگار خانے میں رہ کر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے - ان درباری بھاٹوں اور بے غیرت عاشقوں کے متعلق طالسطائی کہتا ہے :

" کیونکہ ان کا پیشہ امیروں کی خوشنودی ہے اس لئے ان میں خودداری کا احساس باقی ہی نہیں رہتا - قبول عام کی ہوس میں یہ اندھے ہو جاتے اور مدح و ثنا پر اپنا دین و ایمان نثار کر دیتے ہیں - یہ دیکھہ کر کتنا افسوس ہوتا ہے کہ آرٹ کی خاطر یہ زندگی کے لئے بیکار تو ہو ہی جاتے ہیں لیکن یہ بہ ایں ہمہ آرٹ کو فائدہ کیا الٹا نقصان پہنچاتے ہیں - علاوہ بریں یہ لوگ امیروں کی غیر فطری زندگی کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ بیزار ہوکر مر نہیں جاتے بلکہ حسن و عشق کی دنیا میں اپنی روح کو تلاش کرنے کا دلچسپ مشغلہ اختیار کرتے ہیں - امیروں کو آرٹ یہ تلقین کرتا ہے کہ انسان نیکی کے لئے نہیں بلکہ حسن پرستی یعنی عیاشی کے لئے زندہ ہے - امیروں کے زیر سایہ جو غریب رہتے ہیں وہ بھی ان مکروہ جذبات سے

اثر پذیر ہوے بغیر نہیں رہ سکتے جن کی ترجمانی آرٹ کر رہا ہے۔ چنانچہ لوگوں میں وطن پرستی اور اوباشی کے اثرات سرعت سے پھیلتے جاتے ہیں - یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے زمانے کے آرٹ کا وہی حشر ہوا جو ایک عشوہ فروش ہرجائی کا ہوتا ہے - آرٹسٹ فصاحت و بلاغت، عبارت آرائی اور رنگین بیانی میں اپنی ضمیر فروشی اور نفس پروری کو چھپاتا ہے، طوائف روغن و غازہ سے اپنی بد صورتی پر پردہ ڈالتی ہے - غرض کہ ہمارے زمانے اور ہمارے طبقے کے آرٹ اور کسی کسبی میں ذرا فرق نہیں - یہ تشبیہ لفظ بہ لفظ صحیح ہے — آرٹ اتنا ہی خود فروش، سیاہ باطن اور فریب کار ہے ! "

یہ باتیں ہندوستان کے قدیم اور جدید ادب کے لئے زیادہ سچائی کے ساتھہ کہی جاسکتی ہیں۔ دوسرے ممالک میں بھی ادیب اور فن کار ہرزہ سرائی کرتے رہے ہیں لیکن ہم دیکھیں گے کہ ہمارے ادب کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ رہی ہے۔ زمانۂ حال کا سحر طراز ادیب روماں رولاں ادب کے اس رویہ کے خلاف احتجاج کرتا ہوا کہتا ہے - " پچھلی صدی کے ادیبوں اور فن کاروں نے سماج کے ضمیر کو سلا دیا ہے - سماج کی ذمہ داری سے بچنے کے لئے انہوں نے لوگوں کو نئے نئے بہانے سکھا دئے ہیں اور حقیقت سے بچنے کے لئے نئے نئے بت خانے کھڑے کئے ہیں۔ ان کی تاویلوں کے بعد ہر شخص کے لئے یہ کہنے کی گنجائش پیدا ہوگئی ہے کہ سماج کے مظالم اور ستم خیزیوں کے لئے میں ہرگز ذمہ وار نہیں ہوں ! "

آج ادیبوں کی حالت کیا ہے - جو پیشہ ور ہیں وہ فلم کمپنیوں، جاہل کتب فروشوں اور تن آسان ناظروں کے ساتھہ خود کو بیچ رہے ہیں -

جو شوقیہ لکھتے ہیں وہ نہ زندگی کو سمجھتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں - زندگی کھیتوں اور کارخانوں میں ہے نہ کہ آرام کرسیوں اور آراستہ ایوانوں میں - پھر جب کبھی ان سے کہا جاتا ہے کہ تمھارے فرائض و مقاصد کم از کم ایک معمولی انسان جیسے تو نہیں انھیں ان خوش گوار حالات کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہئے تو یہ بندگان خدا 'ادب برائے ادب' کی دھائی دینے لگتے ہیں - مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے لیے زندہ ہیں! ٹوپیوں اور جوتیوں کی طرح بازار کی ضرورت کے لحاظ سے کتابیں لکھتے ہوے اور مشاعروں کی تحسین و آفرین اور امیروں کے مہر و کرم کے خیال سے تک بندی کرتے ہوے بھی یہ لوگ بیباکی سے کہتے ہیں کہ آرٹ صرف انفرادی آزادی کی فضا میں پنپ سکتا ہے - انھیں مخاطب کر کے 'لینن' اپنے اخبار نووازیجن میں ایک جگہ لکھتا ہے : " ہم ادب کو کامل طور پر آزاد کرنا چاہتے ہیں - صرف سیاسی بندشوں سے ہی نہیں بلکہ دولت اور خود غرضی کی پابندیوں سے بھی ہم اسے آزاد کر دیں گے - یہی نہیں بلکہ ہم اسے سرمایہ دارانہ انفرادیت کا خادم بھی نہ رہنے دیں گے —

یہ آخری الفاظ ناظرین کو متضاد معلوم ہوں گے - ممکن ہے کہ کوئی آزادی کا پرستار ادیب چیخ اُٹھے کہ تم سماج کی چکی میں آرٹ کو پیسنا چاہتے ہو، تم اس تخلیقی صلاحیت کو معدوم کرنا چاہتے ہو جو مکمل انفرادی آزادی کی فضا میں ہی پروان چڑھ سکتی ہے - میں کہتا ہوں کہ یہ لمبے چوڑے دعوے تمھاری منافقت کے ثبوت ہیں - جس سماج کی بنیاد کیسۂ زر پر رکھی گئی ہے، جہاں معدودے چند سیٹھ عیش اور مزدور فاقہ کشی کرتے ہیں، وہاں آزادی کا ذکر تک مضحکہ خیز ہے - میں مصنفوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ سرمایہ دار پبلشروں کے دست نگر نہیں ہیں؟

کیا وہ عیاش طبع ناظرین کے زیر احساں نہیں ہیں جو ننگی تصویروں کے دلدادہ ہیں کیا ان کی خاطر 'ادب برائے ادب' میں طوائفوں کا ذکر مسعود نہیں کرنا پڑتا ؟ سماج میں رہتے ہوے آپ سماج سے الگ نہیں ہوسکتے - کسی سرمایہ دار مصنف ' آرتسٹ اور ایکٹر کا دعوئی آزادی — اُس کی جہالت کا پردہ ہے ! "

صحیح ادب کا معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجمانی اس طریقے سے کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اُس سے اثر قبول کرسکیں - اس کے لئے دل میں خدمت خلق کا جذبہ پہلے ہونا چاھئے کیونکہ ادب پیغمبری کی طرح خودگزاری کا مقتضی ہے نہ کہ ملائیت کی طرح پیشہ ور! ماضی ' حال اور مستقبل کو سمجھنا ادیب کے لئے ضروری ہے تاکہ اس کی دردمندی رائیگاں نہ جاے اور وہ تاریخ کے اشاروں کو سمجھا سکے - پھر زندگی کو اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب اس کی آگ میں تپا جاے اور اس کے ھنگاموں میں حصہ لیا جاے - اس کی تگ ودو سے الگ رہ کر اس کے رموز کو سمجھنے کی کوشش ویسی ہی ہے جیسے ساحل پر کھڑے ہوکر دریا کی گہرائی کا اندازہ لگانا - اس صورت میں نہ ادیب زیادہ لوگوں کے احساسات کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اپنی زبان اور پیام اُن تک پہنچا سکتا ہے - یہ معیار بہت بلند اور مشکل معلوم ہوگا اس لئے کہ اب تک ادب پر اس جماعت کا قبضہ رہا ہے جو کسی راجہ کے مشہور درباری کی طرح ندی کی لہریں گننے کی تنخواہ لیا کرتا تھا —

پوچھا جاے گا کہ ادبا و شعرا کون سی راہ اختیار کریں - اپنے تخیل اور تخلیق کی باگ کس طرف موڑیں کہ زندگی کی شاہراہ سے آملیں جس سے ھنوز وہ بہت دور رہے ہیں - روس کا مشہور مفکر ' پرنس کروپاٹکن '

جواب میں کہتا ہے : " اگر تمہارے دل میں بنی نوع انسان کا درد ہے ' تمہارے جذبات کا رباب اُن کے دکھہ سکھہ کے ساتھہ ہم آہنگ ہوتا ہے اور اگر ایک حساس انسان کی طرح تم زندگی کے پیغام کو سن سکتے ہو — تو تم ہر قسم کے ظلم کے مخالف ہوجاوگے ! جب تم کروڑوں آدمیوں کی فاقہ کشی پر غور کروگے ' جب تم میدان جنگ میں لاکھوں بے گناہوں کے لاشے تڑپتے دیکھوگے ' جب تمہارے بھائی بند قید و بند اور دار و رسن کے مصائب جھیلتے نظر آئیں گے ' اور جب تمہاری آنکھوں کے آگے دلیری کے مقابلے میں بزدلی اور نیکی کے مقابلے میں بدی فتح یاب ہوگی — تو ادیبو اور شاعرو ' اگر تم انسان ہو تو ضرور آگے آوگے ! تم ہرگز خاموش نہیں رہ سکتے - تم مظلوموں کی طرف داری کروگے کیونکہ حق و صداقت کی حمایت ہر انسان کا فرض ہے - "

ہر ایمان دار اور صادق ادیب کا مشرب یہ ہے کہ قوم و ملت اور رسم و آئین کی پابندیوں کو ہٹاکر زندگی کی یگانگی اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سنائے - اُسے رنگ و نسل اور قومیت و وطنیت کے جذبات کی مخالفت اور اخوت و مساوات کی حمایت کرنی چاہئے اور ان تمام عناصر کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کرنا چاہیے جو دریاے زندگی کو چھوٹے چھوٹے چھہ بچوں میں بند کرنا چاہتے ہیں - کیا زمانۂ حال کا ادیب یہ کرے گا ؟ اب تک وہ قدامت اور رجعت ' خود پرستی اور ظلم پروری کا ساتھہ دیتا رہا ہے جس کی مثالیں ہم نے مضمون کے دوسرے باب میں پیش کی ہیں - گو یہ تبصرہ مختصر ہے تاہم مجھے یقین ہے کہ غور و فکر کے لیے تھوڑا سا سامان ضرور مہیا کرے گا —

قدیم ادب ہند کا معاشی تجزیہ

پلاسی کی لڑائی سامنتی اور حرفتی تہذیبوں کی ٹکر تھی - اس کے بعد پورے ایک سو سال تک ہندوستانی سماج کا شیرازہ منتشر ہوتا رہا اور سنہ ۵۷ ع کی آخری کشمکش کے بعد سامنتی تمدن نے ہتھیار ڈال دیے - اور یہ معلوم ہوگیا کہ کرگھوں اور ہلوں کے دن گئے اور مشینوں کا زمانہ آگیا - تاہم حرفتی تمدن کا اثر سنہ ۵۷ ع کے بعد زیادہ نمایاں ہوا جس کی گونج پہلے راجہ رام موہن رائے کی مغرب دوستی اور بعد ازاں سر سید کی انگریز پروری میں سنائی دی - ہندوستان کی زندگی میں انقلاب سا آگیا جس کی رو میں پرانی روشنی کے چراغ گل ہونے لگے - جیسا کہ عرض کرچکا ہوں میں نے اسی اعتبار سے ادب ہند کے دو دور مقرر کیے ہیں - کیونکہ اس سے پہلے ہزاروں سال تک ہمارے سماج کی حالت یکساں رہی - پیداوار کے ذرائع ایک سے رہے اور تقسیم کے اصولوں میں بھی کوئی فرق نہ آیا - مقامی حالات میں عارضی طور پر خیرات یا قحط کی وجہ سے یونہی سی تبدیلی ہوجاتی تھی ورنہ وہی آسمان تھا اور وہی زمین —

دنیا کے ہر گوشے میں سامنتی تمدن طبقۂ امرا پر رزم اور بزم کے نقوش چھوڑ جاتا ہے - اس کی پوری زندگی خون آشامیوں یا رنگ رلیوں میں گزر جاتی ہے - ہند قدیم کی تہذیب عوام اور امرا کو مذہبی اعتبار سے بھی دو طبقوں میں بانٹتی اور علم و ادب * کو صرف برہمنوں کا

* علم و ادب —— Knowledge & Literature

اجارہ قرار دیتی ہے - رفتہ رفتہ کشتریوں اور ویشیوں میں بھی علم و فن کے چرچے ہونے لگتے ہیں لیکن عوام الناس یعنی شودروں کو نہ انہیں حاصل کرنے کی فرصت ہے نہ اجازت - بیچارگی سے قناعت اور اس سے قسمت پرستی عبارت ہے اور پچھلے جنم کے ناکردہ گناہوں کے لیے شرمساری اور اگلے جنم کی کامرانیوں کا خیال خام ان میں رس جاتا ہے - پوری سنسکرت اور ہندی شاعری کو چھان ڈالیے ' اساطیر اور افسانوں کا ورق ورق الٹ جائیے ' شاذ و نادر ہی کہیں عوام کا ذکر آتا ہے اور وہ بھی نفرت و حقارت کے ساتھ - البتہ راجاؤں کو رعایا پروری اور عدل گستری کی تعلیم دی جاتی ہے کیونکہ رعایا کی خوشنودی ہی قیام حکومت کی ضامن ہے - سنسکرت کے قواعد ادب اسے لازم قرار دیتے ہیں کہ ہر ادبی تصنیف دیوتاؤں کے علاوہ حکومت اور برہمن جماعت کی دعاے خیر کے ساتھ شروع ہو - برہمنوں کی خداداد برتری اور کشتریوں کے اختیار حکومت کو بار بار دوہرایا جاتا اور ان سے سرکشی کرنے والوں کو جہنمی اور لعنتی قرار دیا جاتا ہے - شودروں کو بار بار ٹوکا جاتا ہے کہ اونچی جاتیوں کی خدمت ان کا فرض منصبی اور دین و ایمان ہے - منیوں اور دیوتاؤں کی نگۂ کرم ہمیشہ روح اور جسم کے خداوندوں کے لیے مخصوص ہے اور ہندو ادب ان کی مدح و ثنا سے لبریز ہے - ' شرنگار رس ' اور ' شانت رس ' سنسکرت شاعری پر چھاے ہوے ہیں کیونکہ ایک امیروں کے صنفی رجحان کو پرچاتا اور دوسرا بوڑھوں کے احساس گناہ کو کم کرتا ہے - خود فریبی کا یہ عالم ہے کہ فضا ٹریجیڈی کے تذکرے تک کی متحمل نہیں اور اسے مخدوش سمجھتی ہے ' چنانچہ ہر سنسکرت ٹریجیڈی خواہ مخواہ کامیڈی میں منتقل کردی جاتی ہے !

اس سماج کا یہ طبقہ کس حد تک عیش و طرب میں ڈوبا ہوا بزم کی رنگینیوں کی داد دے رہا تھا، اس کا اندازہ لگانے کے لیے اس زمانے کے ادب کو دیکھیے۔ اکثر سنسکرت افسانے مثلاً 'دش کمار چرتر' بیتال پنچشت (بیتال پچیسی) اور 'مرچھہ کٹکا' (مٹی کی گاڑی) وغیرہ ڈرامے بد اخلاقی، اوباشی اور قابل نفرت جنسی فساد سے بھرے پڑے ہیں۔ شاعر اور ادیب انہیں یوں مزے لے کر بیان کرتا ہے گویا زندگی کے فرائض یہیں ختم ہو جاتے ہیں۔ عشقیہ شاعری کے لیے جو ہم معنی لفظ 'شرنگار' ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ محبت اور بوالہوسی میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ ہندو اصناف سخن میں 'نائیکہ بھید' اور نکھہ شکھہ ورنن یعنی اقسام معشوق کی شرح اور معشوقہ کے سراپا کو جو مرتبہ و مقبولیت حاصل ہے وہ اس کی شہوت پرست ذہنیت کا پرتو ہے۔ نائیکہ بھید میں جس تجسس اور انہماک سے صرف کنواری ہی نہیں بلکہ شادی شدہ عورتوں کی بدکاریوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ اس فضا کا اخلاقی معیار کیا تھا۔ شعر و ادب اس فضا کے لیے قوت باہ کی گولیوں کا کام انجام دیتے تھے۔ اس زمانے میں طبقۂ امرا کی حالت کیا تھی اس کا اندازہ لگانے کے لیے مہابھارت کے کچھ واقعات پر غور کرنا دور از مبحث نہ ہوگا ـــ

جب ارجن نے کرشن جی کی بہن سبھدرا سے بیاہ کیا تو انہیں جہیز میں ایک ہزار حسین و جمیل دوشیزائیں دی گئیں! یودھشٹر نے جب 'راجسویہ یگیہ' کیا تو انہیں راجاؤں نے ایک لاکھ حسینوں کے پارسل بھیجے! کرشن جی کی ۱۶ ہزار گوپیوں کا قصہ ممکن ہے کہ مبالغہ ہو لیکن مہابھارت اور بھاگوت میں ایسے صدہا واقعات موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے حرم میں ہزاروں عورتیں رہتی تھیں۔ یہی نہیں یودھشٹر کے

'دھرم راج' میں ۸۸ ھزار طلبا کی ضروریات حکومت کی طرف سے مہیا کی جاتی تھیں اور ان میں سے ایک اہم جنس یہ تھی کہ ہر طالب العلم کی خدمت کے لئے ۳۰ دو شہزائیں مقرر تھیں - لطف یہ ھے کہ سبھا بھارت کا مصنف کہیں اشارتاً بھی اس شہوانی گرم بازاری کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتا - یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ھے ورنہ عہد قدیم اس قسم کی بزم آفرینیوں سے جگمگا رھا ھے ! اس زمانے کے لوگ تاریخ نویسی سے بے بہرہ تھے' شعر و ادب میں ھی راوی نے چٹخارے بھر بھر کر یہ کہانیاں سنائی ھیں - یہ اس زمانے کی زندگی کا بزمیہ پہلو اور عشقیہ شاعری میں اس کا عکس ھے - اب ششوپال ودہ راماین وغیرہ رزمیہ نظموں کو دیکھیے - قتل و غارتگری کا کوئی اثر قسم کھانے کے لیے شاعر پر نہیں ھوتا - حتیٰ کہ والمیک اور تلسی داس تک لنکا کی تباھی اور لاکھوں انسانوں کے تہ تیغ ھونے پر اظہار تاسف نہیں کرسکے بلکہ بیواؤں کی آہ اور یتیموں کی فریاد پر یہ لوگ خندہ زن ھیں !

ملک کی آبادی کا ۹۵ فی صدی حصہ کسانوں پر مشتمل ھے لیکن میں نے آج تک کسی قدیم سنسکرت یا ھندی تصنیف میں ان کے حالات نہیں دیکھے - جابجا درندوں اور پرندوں کے رنج و راحت کا حال ھے لیکن کسانوں کا نام تک کہیں نہ ملے گا - کبھی کوئی نیک طینت وزیر راجا کے آگے "پرجا" کی تکالیف کا دکھڑا روتا ھے یا کوئی راجا خیرات کرتا ھے تو احساس ھوتا ھے کہ اس ملک میں 'رعایا' نام بھی کوئی چیز تھی - ورنہ 'مہیوں' 'راجاؤں' بنیوں اور حسینوں کے تذکرے اس کثرت سے ملینگے کہ یقین سا ھو جاتا ھے کہ اس جنت نشان میں ان کے علاوہ اور کوئی نہیں رھتا تھا !

کالیداس اس عہد کا مایۂ ناز ادیب اور شاعر ھے - اس کی سحر طرازی اور جادوبیانی کا لوھا مشرق و مغرب میں سب نے مانا ھے - منظر کشی اور تصویر نگاری میں وہ اپنا مقابل نہیں رکھتا - ایشیا کے شاعروں پر بجا طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ھے کہ ان کا بیانیہ کلام تناسب سے دور ھوتا ھے - ایک کالیداس ھے جس کا ایک ایک لفظ نگینے کی طرح جہاں جم گیا وھاں سے اُٹھہ نہیں سکتا - کالیداس کی یہ حیثیت ھمیشہ قائم رھے گی - لیکن ماحول کا جیسا اثر جذبات پر پڑتا ھے اس کی سبق آموز مثال یہی شاعر بے ھمتا ھے - اس کے آگے انسانیت کا مقصد اگر کچھہ ھے تو محض یہ کہ نیک دیوتاؤں' رحم دل راجاؤں اور ھٹ دھرم رشیوں کی پوجا کرے - شکنتلا میں جا بجا برھمنوں کی عظمت کا اعلان کیا گیا ھے ' رگھوونش' میں رام چندر جی کے اجداد کی فوج کشی اور بزم آرائی کا ذکر ھے - قدرت کے استبداد اور سماج کے مظالم کے خلاف وہ بھی کچھہ نہیں کہتا اور اس کے کردار ایک ھی طبقے میں رھتے اور ایک ھی ماحول میں پرورش پاتے ھیں —

کیونکہ ' ویدک ' عہد میں آرام و آسائش کے سامان کم تھے اس لیے اس زمانے کی شاعری بھی تصنع سے پاک ھے - رفتہ رفتہ جاہ و حشمت کے طلسم کھڑے ھوتے اور عیش و طرب کے نئے نئے سامان مہیا کیے جاتے ھیں - ادب و شعر اس عروج یا زوال کی جو تصویر کھینچتے ھیں اس میں معنی آفرینی کی جگہ ندرت بیان اور لفظی بندشیں لے لیتی ھیں - یہ امر قابل غور ھے کہ علم بیان و معانی کے لیے سنسکرت میں ' النکار ' کا لفظ ھے جو ' زیور ' کا هم معنی ھے - عبارت آرائی و رنگیں بیانی کو اتنی اھمیت دی جاتی ھے کہ ادب آخر میں پہیلیاں بجھوانے لگتا ھے - چنانچہ ' بان بھٹ ' کا کمال یہ ھے کہ الفاظ کو یوں ترکیب دیتا ھے کہ ایک ایک لفظ ۲۰-۲۶

سطروں تک پھیل جاتا ہے اور تشبیہہ و استعارے کے بیان میں اتنی بلند پروازی کرتا ہے کہ مطالب چیستاں بن کر رہ جاتے ہیں - ایک خاص صنف سخن 'بھرمر چھند' ہے جس کی مثال مہا بھارت اور سورداس وغیرہ کے ہندی کلام میں ملےگی - اب تک سخن سنجوں میں یہ بحث ہوتی ہے کہ ان سے شاعر کی مراد کیا ہے - غرض ایسے لفظی تکلفات سے وہ تمام شاعری بھری پڑی ہے اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا - شاعر کے مشاہدات اور احساسات اسے آگے بڑھنے کی اجازت کیوں کر دیتے - ایک خاص بات یہ ہے کہ اس زمانے میں شاعر روح اور جسم میں کوئی امتیاز نہیں کرسکتا اور نہ دوئی کے پردے کو چاک کرنے کی سعئی رائیگاں میں وقت گنواتا ہے - وہ اس زندگی اور اس کی لذتوں کے لیے زندہ ہے اور اسی وجہ سے 'بھرتھری' جیسے دو چار بیراگیوں کو چھوڑ کر حزنیاتی رنگ کم ملے گا اور تصوف کا تو کوسوں پتا نہیں ہے !

'پانچ تنتر'، 'ہتوپدیش' اور 'مدرا راکشس' وغیرہ میں ہمارے لیے ایک جہان عبرت پنہاں ہے کیونکہ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے طبقۂ امرا اور علماے سو کا اخلاق کتنا پست اور انسانیت سوز تھا - مگر افسوس تو اس پر ہوتا ہے کہ شاعروں اور ادیبوں نے اپنے ذمے یہ خدمت لے لی تھی کہ ان بدعنوانیوں کو ایسسی ساحرانہ رنگ آمیزی سے بیان کریں کہ دیکھنے والا نفرین کے بدلے آفرین کہے اور کف حسرت ملے کہ ہم ان محفلوں میں کیوں نہ شریک ہوسکے !

مسلمانوں کی فتوحات کے بعد ہندو سماج کی ذہنیت جس طرح بدلی اُس کے دو بین اثرات ہندی شاعری میں موجود ہیں - ایک تو رزمیہ اور جوشیلی نظموں کی مقبولیت - 'پرتھوی راج راسو' 'همیر راسو

اور 'آلہااودل' وغیرہ اس زمانے کی نظمیں ہیں - بعد میں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں جب ہندوؤں کے خفتہ جذبۂ قومیت میں ہیجان پیدا ہوا تو شیواجی اور درگاداس جیسے سورماؤں کے ساتھ 'بھوشن' اور "رام داس جیسے شاعر بھی پیدا ہوے جنھوں نے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں میں بڑا اشتعال پھیلایا - پچھلے دنوں جب اس ملک میں ہندو، مسلم فساد کی آندھی املڈی تھی تو یہ دونوں فرقہ پرست شاعر قبر میں کروٹ بدلنے لگے تھے —

ہندو مذہبی پیشواؤں کے آگے یہ مسئلہ بھی پیش تھا کہ اسلام کے نرغے سے ہندو عوام کو کس طرح بچایا جاے جو برہمنوں اور پنڈتوں کی دست برد سے عاجز تھے - اس جد و جہد کا اظہار شاعری میں کبیر داس 'دادو دیال' اور تکارام وغیرہ بھگت شاعروں نے کیا - انہوں نے روزمرہ کی زبان میں سمجھایا کہ سارے فساد مذہبی دلالوں کی وجہ سے شروع ہوتے ہیں اور بھگوان کی نظر میں سب انسان برابر ہیں - کبیر داس ہندوستانی جنتا (Masses) کا پہلا اور سب سے بڑا شاعر تھا جس نے امیروں اور پنڈتوں سے بے نیاز ہوکر عوام میں خودداری اور خود احساسی کے جذبات پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی - کیونکہ وہ اور اس کے معاصرین امیروں کی نہیں بلکہ غریبوں کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں' اس لیے ان کا کلام ہر طرح کے الٹے تللوں سے پاک ہے - یہ صحیح ہے کہ گوشہ نشین اور سادھو منش ہونے کی وجہ سے یہ شعرا موت کو زندگی پر ترجیح دیتے اور لوگوں کو زندگی کی تگ و دو سے الگ رہنے اور جسمانی تفکرات سے بے پروا رہنے کی نصیحت کرتے ہیں - چنانچہ کبیر داس ایک جگہ مارتن لوتھر سے ہمنوا ہوکر کہتا ہے کہ پرجا راجا بن جاے تو دنیا کا کام کیسے چلے گا؟

روحانی تسکین کے لیے وہ جسمانی تسکین کو ضروری نہیں سمجھتا —

عشقیہ شاعری کا عنصر ہندو ادب پر اب بھی اتنا ہی غالب ہے جتنا عہد قدیم میں - بنگال میں 'چنڈی داس' بہار میں ودیا پتی اور برج بھاشا میں بہاری 'دیو' متی رام وغیرہ سماج کی اس بے حرکتی اور بے حسی کے نقاش ہیں جو مسلمانوں کے آنے اور یہاں جم جانے کے بعد پیدا ہوگئی تھی - پھر بھی ان میں سے اکثر فطرت اور عوام کے قریب رہتے ہیں' اردو شاعروں کی طرح نوابوں اور معشوقوں کے در پر نہیں پڑے رہتے' لہذا ان کا عشق ایسا بیہودہ نہیں جیسا ان کے مسلمان متاخرین کا - تاہم کوئی نصب العین اور مسلک نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ بھی 'کرشن' اور گوپیوں کے تذکرے سے آگے نہیں بڑھتے جس سے ان کا محدود زاویۂ نگاہ ظاہر ہوتا ہے - میرا خیال ہے کہ اگر 'کرشن جی' پیدا نہ ہوتے تو شاید قدیم ہندی شاعری کا بڑا حصہ نہ لکھا جاتا - یہ ہندو طبقۂ امرا کی ذہنیت کا اظہار ہے جسے بڑھاپے میں اپنے بچپن کے افسانے سننے میں لطف آتا ہے - رام اور کرشن کی فتوحات میں یہ لوگ ظالموں کی شکست کا خواب دیکھ رہے ہیں —

اردو ادب کے دور قدیم پر کچھ کہنے سے پہلے دو تین باتیں یاد رکھنی ضروری ہیں - ایک یہ کہ اردو ادب کا پیش منظر ایرانی ہے - عروض' بیان' معانی' تشبیہ و استعارات اور اساطیر ہی نہیں تقریباً تمام اردو شعرا کی ذہنیت بھی غیر ملکی ہے - معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایرانی دس سال عرب میں رہنے کے بعد ہندوستان آیا اور یہاں کی زبان میں شاعری کرنے لگا - وجہ ظاہر ہے - مسلمان حکمراں طبقے اور عوام کے مابین ایک سد سکندری قائم تھی - حضرات شعرا میں سے کم ایسے

ہوے ہیں جو دیہاتوں اور جنگل پہاڑوں کی سیر کرچکے ہوں - شہروں میں اور وہ بھی محبوب کی گلیوں اور نوابوں کے آستانوں میں ان کی عمریں گزر جاتی ہیں - 'درد' اور 'نظیر' جیسے شاعر کم ہوے کہ جنھوں نے شاعری کو اپنا پیشہ نہ بنا لیا ہو - جب شاعری ایک جنس سمجھ لی جاے تو اُسے بازار کے خرید و فروخت کے اصولوں کے ماتحت رہنا پڑتا ہے اور چونکہ اس کے خریدار صرف دولت مند ہوتے ہیں لہذا ان کے ذوق و طبیعت کا پاس لازمی ہے ورنہ میر تقی میر کی سی حالت ہوجاے - اب درد جیسے صوفیوں کو دیکھیے کہ دنیا سے الگ رہتے اور نظم میں عبادت کرتے ہیں - ممکن ہے کہ حیات بعدالموت کے مسائل کے لیے اُن کی راہبانہ شاعری مفید ہو ورنہ جہاں تک اس زندگی اور اس کے ارتقا کا سوال ہے ' اس قسم کی شاعری 'کرم' اور 'قسمت' کے اصولوں کی طرح عوام کے لیے مضر اور جوش عمل کے حق میں نشہ آور ہے —

اردو شاعری کا ایک بڑا حصہ قصائد پر مشتمل ہے جن پر کچھ کہنا لاحاصل ہے - قصیدہ خواں شاعر ایک ایسا مصاحب ہے جو مقفیٰ تک بندی کرلیتا ہے - غزل گوئی میں اظہار واردات کا دائرہ اتنا محدود رہ جاتا ہے اور قافیہ و ردیف کے ساتھ کیفیت کی یک رنگی کا وہ عالم ہوتا ہے جیسے کوئی مشین ایک رفتار سے ایک سی آواز کرتی چلی جارہی ہے - اب ان متمول اور متوسط طبقوں کے ماحول کو دیکھیے جس میں لوگ روز ایک ہی طرح کے کام کرتے ہیں - ان کے مشاغل اور دلچسپیوں میں کبھی فرق نہیں آتا تھا - آمد و رفت کے ذرائع کم ہونے کی وجہ سے سفر کی نوبت بھی کم آتی تھی - نہ اخبارات شائع ہوتے تھے اور نہ خطوط آسانی سے آجاسکتے تھے تاکہ باہر کے حالات معلوم ہوسکیں - اس بے رنگ و بو

زندگی کی جھلک غزل کی مقبولیت کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ معشوق سے ہم کلام ہونا — یہ دوسری بات ہے کہ وہ عرش آشیاں تھا یا فرش نشیں — اردو شاعر کا سب سے اہم فریضہ تھا! بجز مثنوی اور مرثیے کے دوسرے اصناف سخن کی زبوں حالی اس طبقے کی کم نگہی اور محدود خیالی کی دلیل اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اس زمانے کی اردو شاعری امیروں کی تفریح کے سوا کوئی کام انجام نہ دے سکی۔ اس میں دو رجحانات زیادہ واضح ہیں۔ ایک تو 'معشوق حقیقی' سے خطاب اور جسم کی قید سے آزادی کے لیے روح کی بے کلی۔ یہ صوفیوں کی ترجمانی ہے جو نام نہاد مسلمان امرا کی عیش کوشی اور منافقت سے تنگ آکر دنیا سے بیزار ہو گئے اور ایک جہان نو کی طرح ڈالنے لگے۔ غربت اور افلاس کی وجہہ سے جن شاعروں کی پہنچ محفل جاناں میں نہ ہو سکتی تھی' انہیں بھی اچھا بہانہ ہاتھ آیا اور وہ جمال باری کے آئینے میں جلوۂ یار دیکھنے لگے!

فتح ہند کے بعد ہی مسلمان امرا اور علما میں تنازع شروع ہو گیا تھا۔ مذہبی جماعت امور سلطنت میں دست اندازی کی متواتر کوشش کرتی رہی جس میں اسے سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ مولویوں نے رئیسوں کو احتساب کی تلقین کی بلکہ کئی مرتبہ مے خانوں پر پہرے بھی لگادیے' جس کی وجہ سے عیش پسند اور رند مشرب ان سے سخت ناراض رہنے لگے۔ چنانچہ فارسی اور اردو شاعری میں عام طور پر محتسب' زاہد اور شیخ کی جس بری طرح خبر لی گئی ہے شاید بولشیوک شاعروں نے سرمایہ دار معشوقوں کو بھی اتنا نکو نہ بنایا ہوگا۔ در اصل یہ اس ماحول کی رند روشی اور احتساب و شریعت کی پابندی سے بیزاری کا اظہار ہے —

تاریخ شاہد ہے کہ عہد وسطیٰ میں عموماً اور اورنگ زیب کے بعد خصوصاً

مسلمانوں کے زوال کے ساتھہ سماج میں ایسی ابتری پھیل گئی جس کی مثال نہیں ملتی - دلی اجڑنے لگی اور لکھنؤ کی چمن بندی شروع ہوئی - نادر شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے حملوں نے دلی کو جیسا خستہ و خراب کیا اس کا اضمحلالی اثر میر درد اور دلی اسکول کے دوسرے شاعروں پر کم و بیش نمایاں ہے - لکھنؤ کی خوشحالی اور خوش باشی کا اثر وہاں کے شاعروں پر جیسا کچھہ پڑا اس کے آئینہ دار 'امانت' 'رشک' 'رند' اور جان صاحب' وغیرہ ہیں - 'آتش' ان سے کسی قدر الگ ہے کیونکہ دوسرے لکھنوی شاعروں سے اس کی زندگی مختلف ہے —

تمام ہندوستانی شعرا زندگی سے کتنے بے خبر اور بے پروا تھے، ان کے جذبات کتنے اوچھے اور احساسات کتنے بے حقیقت تھے' اس کا اندازہ لگانے کے لیے چشم عبرت کی ضرورت ہے - پلاسی کی لڑائی کتنا بڑا قومی سانحہ تھا ' پانی پت کی تیسری لڑائی ہندو طاقت کے لیے پیام موت تھی ' ٹیپو سلطان کی شکست مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے تنزل کا اعلان تھا - اور ان سب سے اہم سنہ ۵۷ ع کا سانحہ تو ہندوستانی سماج کی بربادی کا پیش خیمہ تھا - کتنے شاعروں نے ان خونچکاں واقعات کو نظم کیا ؟ کتنے نوحے لکھے گئے ؟ کہاں تھے وہ رجز گو مرثیہ خواں جن کی جادو بیانی سے محرم کی ہر محفل ماتم کدہ بن جاتی تھی ؟ کسی بڑے شاعر نے پلاسی کی لڑائی * پر ایک نوحہ نہ لکھا - واقعۂ سنہ ۵۷ع پر داغ کا شہر آشوب اور غالب کے خطوط پڑھیے اور سر پیٹ لیجیے کہ جب پورے ملک کی قسمت

* گذشتہ صدی کے آخر میں جب بنگالیوں میں قومیت کا احساس پیدا ہونے لگا تو اس سانحے پر ان کے شیریں مقال شاعر نوین چندر سین نے ایک ولولہ انگیز نظم بعنوان " پلاسیر یودہ " لکھی - اسی طرح اس موضوع پر بنگال کے مشہور شاعر نذرالاسلام نے بھی ایک نظم قلمبند کی ہے واقعہ سنہ ۵۷ ع پر منیر شکوہ آبادی کے کچھہ کلام اور شاہ ظفر کی کچھہ غزلوں کو مستثنی سمجھنا چاہئے -

کا فیصلہ ہو رہا تھا ' یہ حضرات اپنی روٹیوں کے سوا کچھہ نہ سوچ سکتے تھے
اور سوچتے تھے تو ایسے بزلادنہ اور رجعت پرورانہ طریقوں سے جو زندگی
اور شاعری کے لیے باعث ننگ ہیں —

اس ادب کی مثال امربیل سے دی جاسکتی ہے جو اسی درخت کو
فنا کرتی ہے ' جس پر پرورش پاتی ہے - کیونکہ عہد قدیم کے تمام شاعر
پیشہ ور تھے اور نوابوں اور راجاؤں کے منت کش تھے لہذا امیروں کے مفاد سے
اُن کا اثر پزیر ہونا لازمی تھا - اُن کی خوشنودی کے لیے اُن کی زبان میں
بولنا بھی ضروری تھا اور بعد میں تو زبان دانوں کے معرکے بٹیروں کی پالی
کی طرح عام ہو گئے - اردو زبان میں بال کی کھال جس طرح نکالی گئی
شاید اس کی مثال دنیا میں اور کہیں نہ ملے گی - معنی پر زبان کو
ترجیح دینا ' اس طبقے اور اس کے لگے لپٹوں کے جھوتے نظریۂ زندگی کا
ثبوت ہے جو نظام زندگی پر سانپ کی کینچلی کی طرح چھائے ہوے تھے -
اس صورت حال کو دیکھہ کر طالسطائی کے اس خیال سے اتفاق کرنا پڑتا ہے
کہ "ہمارے سماج میں لوگ اکثر کہا کرتے ہیں کہ اگر کوئی آرٹسٹ فکر
معاش سے آزاد ہو جائے تو زیادہ بہتر کام کر سکتا ہے - یہ خیال میرے اس
دعوے کی پرزور تائید کرتا ہے کہ ہم جس چیز کو آرٹ سمجھتے ہیں وہ
ہرگز آرٹ نہیں بلکہ اس کی پرچھائیں ہے ! آرٹ اور صنعت میں بڑا فرق
ہے - آرٹ فن کار کے ہیجانات کو دوسروں تک منتقل کرنے کا ایک ذریعہ
ہے - ہیجان اسی آدمی میں پیدا ہوگا جو ایک معمولی انسان کی طرح
اپنی فطری زندگی کے ہر پہلو کو نشو و نما حاصل کرنے کا موقع دیتا ہے -
اگر فن کاروں کو مفت کی روتیاں ملیں تو ان کی تخلیقی قوت برباد ہو
جائے گی - کیونکہ پھر قدرت اور سماج سے خود حفاظتی کے لیے وہ کیسے لڑیں گے

اور ان مصائب کو کیوں کر سمجھیں گے جن سے فکر معاش میں ہر فرد بشر کو دوچار ہونا پڑتا ہے - اس طرح وہ سب سے اہم ہیجانات سے محروم رہ جاتے ہیں جو ہر آدمی میں کم و بیش موجود ہیں اور انفرادیت کے ارتقاء کے لئے ناگزیر ہیں - آج ہمارے سماج میں آرتسٹ جس عیش و اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہے ' اس سے زیادہ مضر ماحول کسی فنی تخلیق کے لئے ہو نہیں سکتا —

اردو شاعروں میں درد ' اور ' نظیر ' جیسے معدودے چند لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگ وظیفہ خوار تھے - ' درد ' دنیا سے بیگانہ اور ' میر ' اپنی ناکامیوں کی وجہ سے زندگی سے بیزار ! اس لحاظ سے دونوں زندگی کے لیے ضروری جذبات کے اظہار سے اجتناب برتتے ہیں - افسردگی ' رہبانیت اور حزنیت کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے' بد نصیبی اور ناکامی کے گلے ہیں ' حسرت و یاس کے افسانے ہیں - زندگی کی کش مکش سے الگ رہنے اور فطرت سے محظوظ نہ ہو سکنے کی وجہ سے ان حضرات کو برائیوں کے سوا کہیں کچھہ نہیں دکھائی دیتا - چونکہ میں اظہار جذبات کو جذبات پر ترجیح نہیں دیتا ' اس لئے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ شاعر کہتا کیا ہے ' کیسے کہتا ہے کا سوال بعد میں آتا ہے - ' نظیر ' کے یہاں حسن بیان کی کمی اور عامیانہ جذبات کی زیادتی ضرور ہے جس کی وجہہ اس کی آوارہ اور خانہ بدوش زندگی ہے - لیکن پورے اردو ادب میں وہی ایک ایسا شاعر ہے جو عوام کے ساتھہ رہتا ' انہیں سمجھتا اور اُن کے تاثرات کو انہیں کی زبان میں بیان کرتا ہے - اس زمانے کی زندگی کا معیار اتنا جاہلانہ تھا کہ ادیب سے زیادہ توقع نہیں کی جا سکتی - اگر وہ اپنے زمانے کی صحیح تصویر پیش کردے اور ساتھہ ہی قلب میں جذبۂ درد مندی رکھتا ہو تو

بہت ہے - اس لحاظ سے نظیر تلسی داس اور کبیر داس سے پیچھے ہے - تاہم وہ ایک عام شہری کی نظر سے دنیا کو دیکھتا اور اپنے آئینۂ زندگی میں وہ تمام خرابیاں دکھاتا ہے جو اسے نظر آتی ہیں - طور اور نجد کے تذکرے اُس کے کلام میں ناپید ہیں - وہ بوڑھوں ' غریبوں اور فقیروں کے ساتھ رہتا اور انہیں قوت گویائی بخشتا ہے - افسوس کہ نظیر محنت کش نہ تھا ورنہ اس کا زاویۂ نگاہ بلند ہوتا - اپنی تمام برائیوں کے باوجود ہندوستان کے ادب قدیم میں اسے ایک خاص مرتبہ حاصل ہے - کبیر عوام کا مصلح ہے تو نظیر ان کا یار غار ہے - کاش یہ دونوں فقیر نہ ہوتے !

• چند صفحات میں ہزاروں سال کے ادب کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا - ہم نے اپنے تجزیہ کے مطابق یہ اصول قایم کیا تھا کہ ادب جذبات کا اظہار ہے اور جذبات ماحول سے متاثر ہوتے ہیں - اچھے جذبات اچھے ماحول کے محتاج ہیں - پھر یہ بھی دیکھا کہ زندگی ارتقا بالضد کے زینوں سے شاہراہ ترقی پر گامزن ہے اور ادب اس وقت تک زندگی کا آئینہ دار نہیں ہو سکتا جب تک اس کا ہمدوش نہ ہو - ادیب کا فرض ہے کہ ماضی کے عیوب سے حال کو باخبر کرے اور حال کی تصویریں کھینچے کہ اس میں مستقبل کے لیے اشارات پنہاں ہوں - جب ہم نے اس روشنی میں ہندوستانی ادب کو دیکھا تو مایوسی اور شرمساری کے ساتھ ہم گورکی سے ہم آہنگ ہو کر چیخ اٹھے کہ " ماضی کے بت کو پوجنے والے شاعرو حال کی برائیوں کو چھپانے والے ادیبو اور مستقبل پر تاریکی کا پردہ ڈالنے والے افسانہ نگارو مت جاؤ ورنہ تاریخ تمہیں مٹا دے گی ! "

اردو شاعری کے عیوب کے لیے کئی اسباب ذمہ وار تھے - ایک یہ کہ وہ اس زمانے میں پھولی پھلی جو مسلمانوں کی حکومت اور سامنتی تمدن

کے زوال کا دور تھا - جس طبقے نے اسے گود لیا وہ خود قعر مذلت میں پڑا ہوا تیزی سے بربادی کی طرف چلا جا رہا تھا - پھر اس کی تربیت ایسے ھاتھوں سے ہوئی جنھوں نے نان بائی کی دکان کی طرح اسے اپنی روٹی کمانے کا وسیلہ بنا لیا - یہ تو تھا ھی ساتھہ ساتھہ ایک تنگ نظر سوسائیٹی میں پرورش پاکر اس نے اپنے لیے عرصہ حیات تنگ کر لیا - سماج کے دباؤ اور اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے شاعر بہت کم موضوعات پر لکھہ سکتا تھا - ادب کا پودا آزادی کی ہوا میں ھی پروان چڑھے گا - پھر یہ بھی ھے کہ پودے کی بیجا سختی اور جنسی تشدد کی وجہ سے گلوے تغزل میں پھانسی کا پھندا سا پڑ گیا - اردو شاعری کی معشوقہ — اگر ایسی کوئی چیز ھے تو — ایک ھرجائی طوایف ھے اور سوچئے کہ اس سے کسی قسم کا لگاؤ شاعری کی نازک روح پہ کس قدر گراں ثابت ہو گا —

اس تجزیہ سے کسی کی تنقیص یا تضحیک مقصود نہیں - اس بحث کا ماحصل صرف یہ ھے کہ زندگی کی حفاظت اور ترقی کا مسئلہ سب سے زیادہ اھم ھے اور کسی چیز کو اس پر فوقیت اور برتری نہیں دی جا سکتی - ادب زندگی سے عبارت ھے نہ کہ زندگی ادب سے - ادب کے نام پر جو چیز انسان کو زندگی سے بیزار ھونے کی تعلیم دیتی ھے انسان کو فوراً اس سے بیزار ھو جانا چاھیے - سچ پوچھا جاے تو اس دور کے تقریباً تمام آرٹسٹ صناع ہوے ھیں - اس وقت تک صحیح معنوں میں آرٹ کا ارتقا ھوا ھی نہیں - کالیداس ، کبیر ' نظیر اور غالب وغیرہ کے سوا شاید کوئی ایسا شاعر نہیں جسے مستقبل کا انسان عزت سے یاد کرے گا —

هندوستانی ادب کے دور جدید کا معاشی تجزیہ
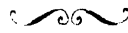
هندوستانی ادب کے دور جدید پر هم زیادہ تفصیلی نظر ڈالیں گے کیونکہ اس کا براہ راست هماری نسل سے تعلق ہے اور اس کی ترکیب و تدوین همارے هاتھوں هو رهی هے —

اشاروں میں پہلے هم یہ دکھلا چکے هیں کہ سماج کی بنیاد افراد کے اقتصادی تعلقات پر منحصر هے اور ان کے رشتۂ مادی کے اعتبار هی سے کسی دور کی ذهنی و روحانی تحریکات کو سمجھا جا سکتا هے - علاوہ بریں' ادب اب تک تعلیم یافتہ طبقے کا اجارہ رها هے اور اس کی گهرائیوں تک پہنچنے کے لیے اس طبقے کے رجحانات کو پہچاننا بے حد ضروری هے - سچ پوچھو تو همارے ادب کے سر چشمہ سے جو نئی نئی نہریں کٹ رهی هیں وہ دراصل متوسط طبقے کی حالت کا پتا دیتی اور اس ذهنی رد عمل کو ظاهر کرتی هیں جو ایک طرف تو حرفتی اور سامنتی تمدن کی کش مکش اور دوسری طرف هندوستانی قومیت یعنی دیسی حرفت اور غیر ملکی ملوکیت کے تصادم کی وجہ سے ان میں پیدا هوگئی هے —

سنہ ۱۸۵۷ کے بعد انیسویں صدی کے اواخر تک هندوستانیوں کی ذهنیت میں سرعت سے ایک انقلاب هوتا رها کیونکہ انسان جب اپنے مادی

حالات میں رد و بدل کے لیے مجبور ہوتا ہے تو ان کے قبول کرنے کے لیے تاویلیں بھی پیدا کرلیتا ہے۔ مسلمان حکمراں طبقہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے برسر پیکار رہ کر انحطاط پذیر ہوچکا تھا اب اس کی پذیرائی کے لیے مجبور ہوا - چنانچہ علی گڑہ تحریک در حقیقت نئی تہذیب کی فتح کا اعتراف تھی - پچاس سال پہلے راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں جو تحریک شروع کی تھی سر سید نے اب اس کی تجدید مسلمانوں میں کی اور دونوں کا رد عمل قومی زندگی پر تقریباً ایک سا ہوا - جب نئی تہذیب کے نشے میں سرشار ہوکر ایک دو نسلیں بنگال میں نکل چکیں تو وہاں کے اکابر کو یکایک محسوس ہوا کہ انگریزی زبان اُن کی زندگی میں ناسور ڈال رہی ہے' درآں حالیکہ ناسور پہلے سے موجود تھا جسے یہ مغربی نشتر اب ابھار کر دکھا رہا تھا۔ سرکاری نوکریوں میں فرقہ وارانہ تمیز کی وجہ سے آہستہ آہستہ ہندو مسلم کی تفریق بڑھتی گئی - ادھر زندگی کے نئے نظریوں نے قدامت کا قلع قمع شروع کیا اور ضرورت ہوئی کہ پرانی شراب نئی بوتلوں میں ڈھالی جاے اور اس پر جدت کی چھینٹیں چھڑکائی جائیں- فرقہ وارانہ تفریق کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں قومیں اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے اپنی اپنی معاشرت اور تاریخ کے تاریک پہلو کو چھپائیں' اپنے ماضی کو بڑھا چڑھا کر دکھائیں اور ساتھہ ساتھہ نئی روشنی کے حملوں سے بچنے کے لیے جدید کو اپنے مشق ستم کا ہدف اور 'قدیم' کو تمام خوبیوں کا منبع ثابت کریں ــــ

چپکن اور گھٹنے کے ساتھہ مسلمان متوسط طبقے نے طلسم ہوشربا اور اندر سبھا کا بانا بھی چھوڑا اور نئے خیالات کے اظہار کے لیے نئے پیراے نکالے - انگریزی تعلیم کی مقبولیت نے ان کے آگے قدرت کے نئے مناظر پیش

گئے اور سماج کے ساتھہ 'ادب کو بھی پابندیوں سے آزاد کرنے کی کوشش ہونے لگی - نظام حکومت کی تبدیلی نے اس طبقے کو مجبور کر دیا کہ تحفظ حیات کے لیے اپنی ذہنیت کو مادی ضروریات کے لحاظ سے بدلے اور پھر تو اسے یکا یک معلوم ہونا بھی چاہئے تھا کہ مذہب کا وہ تصور غلط ہے جو اسے حرفتی تمدن کے ساتھہ چلنے سے روکتا ہے - زندہ رہنے کے لیے قبل از غدر کی رومانی اور داخلی (Subjective) فضا سےنکل کر واقعیاتی نقطۂ نگاہ پر آنا ضروری تھا اور اب ادب و زندگی میں بے ربطی اس طبقے کے لئے مضرت رساں تھی - قعرمذلت میں پڑے ہوے مسلمانوں کے جگانے کے لیے بیانیہ اور خطیبانہ انداز اختیار کرنا ضروری تھا - نظم کا عروج اور غزل کا زوال خود فریبی پر خود تنقیدی ' تصور پر عقل اور پابندی پر آزادی کی فتح یابی کا ثبوت ہے - نئے جذبات اپنے لیے نئے اصناف تلاش کر لیتے ہیں - ادھر بنگال میں ٹیگور نے پیش پا افتادہ اور پامال بحروں کو چھوڑ کر اپنے لیے ایک نئی طرز کی طرح ڈالی - اس کاوش میں اسے عہد وسطیٰ کے ویشنو شاعروں سے بڑی مدد ملی جو سماج کی پابندیوں کے ساتھہ سنسکرت چھندوں کی قید سے بھی آزاد تھے اور اپنی تیز رفتاری کے لیے نئی راہیں تلاش کرتے تھے - ہندی پر ان دوتحریکوں کا گہرا اثر ہوا اور برج بھاشا کو چھوڑ کر لوگوں نے کھڑی بولی کو اپنایا جو میرے خیال میں سنسکرت آمیز اردو ہے - اسی طرح گجراتی اور مرہٹی میں بھی شاعری نے نیا رنگ روپ اختیار کیا - غرض زندگی کے ساتھہ شاعری کا ظاہر بھی بدلا - اب یہ دیکھیے کہ زندگی کی مختلف النوع تبدیلوں کے ساتھہ ادب کے موضوعات اور رجحانات بھی کیسے بدل رہے ہیں —

'سرشار' اور ' مولوی نذیر احمد' کے ناول سامنتی تمدن کی پستی کے

دور کا نقشہ کھینچتے ہیں جو اب اتنی نمایاں تھی کہ چشم پوشی سے کام نہ چل سکتا تھا - یہ دونوں حضرات لکھنؤ اور دلی کی زندگی سے خوب آشنا تھے اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں شہر مسلمان حکمراں طبقے کے نقش آخر اور اب ان کے انتہائی تنزل کے آثار تھے - سجاد حسین کا اخبار ایک چھوتے پیمانے پر وہی کر رہا تھا جو 'مولیر نے فرانس میں اور' سروونٹس' نے اسپین میں صدہا سال پہلے کیا تھا - یہ دونوں سامنتی تمدن کے دور انحطاط میں پیدا ہوتے اور اپنے طنز کے تیروں سے اس کی زندگی دوبھر کر دیتے ہیں - سجاد حسین اور سرشار نے اپنی بساط کے مطابق یہی کیا -

ادھر ہندؤوں اور مسلمانوں کی تفریق نے ان میں فرقہ پرستی کے بیج بو دیئے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ادب پر مردہ پرستی کی مہر لگ جاے اور دونوں قوموں کے اہل قلم ایک دوسرے پر چشمک زنی شروع کریں - ادب کی زندگی کا نیا دور انگریزی زبان کی رومانی تحریک سے متاثر تھا اور اس جذبۂ قومیت کے اظہار کے لیے رومانی ناول سب سے زیادہ مناسب تھے - چنانچہ بنگال میں 'بنکم چندر' اردو میں مولانا شرر اور مرہٹی میں آپٹے نے ناول نگاری کو نئے طریقے سے چمکایا - بنگال میں انگریزوں کے خلاف نسلی تعصب کے جذبات پھیل رہے تھے اور اس طرح بنکم چندر کے ناولوں میں مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کے مظالم کی بھی داستان ہم پڑھتے ہیں - تعجب کا مقام ہے کہ اس زمانے کا یہ سرکاری عہدہ دار اور خطاب یافتہ مصنف دل میں وہ ولولۂ قومی رکھتا تھا کہ اس کا ایک ناول 'آنند متھہ' بنگال میں نراج (Anarchism) کا محرک اور اس کا گیت بندے ماترم قومی تحریک کا ترانہ بن گیا - 'شرر' اسلامی فتوحات کا قصہ گو ہے لیکن بنکم چندر کی تحریروں سے پیچ و تاب

کھا کر 'منصور موھنا' جیسے ناولوں میں اپنے معاصر کی 'چنچل کماری' کا جواب دیتا ھے - شکر ھے کہ ادب کے سر سے یہ آسیب جلد اتر گیا اور بعد میں صرف اخباری نظموں اور 'افسانہ' کے نام سے منسوب کی جانے والی چیزوں میں اس کا اثر باقی رہ گیا —

حالی کی مسدس نے شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور ان کے ہم عصر اردو اور ھندی کے شاعروں نے اس قسم کی شاعری کو خیالات کی تبلیغ کے لیے بہت موزوں سمجھا - موجودہ دور کے ھندی شاعروں میں 'بابو میتھلی شرن گپتا' کا رتبہ بہت بلند ھے - مسدس سے متاثر ھوکر انھوں نے 'بھارت بھارتی' نامی نظم لکھی جو ھندی میں بے حد مقبول ھوئی - موضوع دونوں کا ایک ھے، دونوں کارنامۂ اسلاف سنا کر زمانۂ حال کی زبوں حالی کی تصویر کھینچتے اور اپنی اپنی قوم کو پیام عمل سناتے ھیں - مسدس جس کی نقالی ھندی اور اردو دونوں زبانوں میں کی گئی، ادبی انقلاب اور قومی بیداری کی خبر دیتی ھے - اس کے چند سال بعد ھی انڈین نیشنل کانگرس وجود میں آتی ھے اور کچھہ عرصے بعد بنگال سودیشی تحریک شروع ھوتی ھے - یہ قومی اور سیاسی تحریکیں بیداری کے آثار ھیں - ان کے محرک اور موید ایک تو وہ لوگ تھے جو سیاسیات اور حکومت میں شرکت کے طالب تھے یا وہ لوگ جو قومی حقوق یعنی دیسی صنعت و حرفت کی توسیع کا مطالبہ کررھے تھے - ھندوؤں میں عموماً اور بنگال میں خصوصاً قومی خودداری کا احساس بڑھتا جاتا تھا اور سیاسی بیداری کے ساتھہ ادب میں بھی جوش و ولولہ کے اثرات پیدا ھونے لگے تھے - گذشتہ صدی کے اواخر میں جب نیل کی کاشت کے انگریز اجارہ داروں کے مظالم حد سے تجاوز کرچکے تو ایک

بنگالی مصنف کا ڈراما موسومہ 'نیل درپن' ہی تھا جس نے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک احتجاج کا علم بلند کر دیا اور بالآخر حکومت کو ان شکایتوں کو رفع کرنا پڑا - 'نوین چندر سین' نے پلاشیر جدھ (پلاسی کی لڑائی) کے عنوان سے ایک عدیم النظیر رزمیہ نظم لکھ کر بنگال کو اس خوں چکاں واقعے کی یاد دلائی اور مشہور ڈراماتسٹ ڈی - ایل - رائے نے کئی قومی گیت لکھے جو آج بھی بنگال کے بچے بچے کی زبان پر ہیں —

نئی روشنی اور پرانی روشنی کا تنازع در اصل ہندوستانی سماج کی اس کش مکش کو ظاہر کرتا ہے جو مشینوں کے عروج اور دست کاری کے زوال کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی - ہمارے تعلقات کی نوعیت بدل رہی تھی جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نظریۂ زندگی بھی بدل جائے - یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے کہ مستقبل کی تاریکی انسان میں ماضی کی پرستش کا جذبہ پیدا کردیتی ہے چاہے وہ بذات خود کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو - جس طرح بوڑھا عہد پیری میں اپنے بچپن کو یاد کرتا ہے درآں حالیکہ یہ یاد بے سود ہے، اسی طرح جب کوئی تہذیب غارت ہوتی ہے تو اس کے نام لیوا زمانۂ قدیم کی مدح سرائی کی صورت میں اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہیں - روس میں سامنتی دور کے انحطاط اور سرمایہ داری کی اٹھان کے ساتھ 'طالسطائی' پیدا ہوتا ہے، انگلستان میں 'رسکن' اور 'کارلائیل' مشینوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں، فرانس میں 'روسو' رجعت قہقری کی حمایت کرتا ہے - اس دور کے ہندوستانی ادیبوں میں بھی بڑی حد تک یہ ذہنیت کام کررہی ہے - چونکہ ہندو اور اسلامی تمدنوں کا امتیاز متوسط طبقے میں رہتا آیا ہے اور یہی لوگ ہنوز قومی زندگی کے نگہبان اور علم و ادب کے پاسباں رہے ہیں، اس لیے اپنی اپنی

روایتوں کے لحاظ سے یہ اس جذبۂ شکست کا اظہار کرتے ہیں - 'طالسطائی' جس قسم کے نراج کی تبلیغ کرتا ہے وہ ہندو تمدن کے عہد زریں کی تصویر ہے - عدم تشدد، رہبانیت، مشینوں کا ناس اور اس قسم کی چیزیں ہندو تمدن کے عناصر میں سے ہیں اور ان کے لئے قابل قبول ہیں - اسی وجہ سے 'طالسطائی' کے اصول' 'ٹیگور' کے ادب اور 'گاندھی جی' کی تحریکوں پر ایک گہرا نقش چھوڑ گئے ہیں' حالانکہ میرے خیال میں 'ٹیگور' اس روسی ادیب سے قریب تر ہے - مسلمان ادبا بھی دور حرفت اور مشینوں سے منحرف ہیں لیکن ان کی برائیوں کا حل وہ اسلامی روایتوں کے مطابق تلاش کرتے ہیں - تاہم دور حرفت اور سائنس سے کلیتاً بغاوت اور ماضی کی پرستش اس دور کے ادب کی بڑی خصوصیتیں ہیں - 'اکبر الہ آبادی' 'اقبال' اور 'ٹیگور' جابجا مغربیت کے خلاف مشرقی معاشرت کی طرف سے صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں - خصوصاً 'اکبر' کو ہر پرانی چیز اچھی اور ہر نئی چیز بری معلوم ہوتی ہے - لیکن چونکہ وہ کوئی مفکر نہیں اس لیے اپنے باقی دونوں معاصروں کی طرح موجودہ مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کرسکتا —

ادب ہند کے موجودہ رجحانات کو سمجھنے کے لیے سرسری طور پر یہ دیکھہ لینا چاہئے کہ انیسویں صدی کے اواخر سے ملک میں کیسی کیسی تحریکیں بنتی اور بگڑتی رہی ہیں —

دیسی سرمایہ داروں کی تحریک بنگال کی سودیشی تحریک سے شروع ہوکر سنہ ۲۲-۲۰ ع کے عدم تعاون میں اپنے حد عروج کو پہنچتی اور پھر رفتہ رفتہ کم زور ہونے لگتی ہے اور گزشتہ تحریکوں کے بعد پر شکستہ ہو جاتی ہے - قومی تحریکوں کی وسعت کے ساتھہ ہندو مسلم اتحاد کا صور پھونکا

جاتا ہے اور ہندی اور اردو کو ملانے کی کوشش ہونے لگتی ہے - عربی فارسی اور سنسکرت کے الفاظ کا استعمال کم کرنے کی سعی بھی کی جاتی ہے اور ہندی میں اردو اور اردو میں ہندی الفاظ مقبول ہونے لگتے ہیں - مسلمان متوسط طبقے پر چونکہ حجاز و شیراز کا رنگ چڑھا رہا ہے لہذا ان کی تہذیب میں بڑی غیر ملکی عنصر پایا جاتا ہے - یہ ایک عجیب بات ہے کہ وطن پرستی کے نقطۂ نظر سے اردو نے جو سب سے بڑا شاعر پیدا کیا وہ کوئی مسلمان نہیں بلکہ ایک ہندو یعنی 'برج نارائن چکبست' آنجہانی تھے - ہندو متوسط طبقہ ان تحریکوں میں پیش پیش رہا ہے اور اسی لیے اس کا ادب زیادہ قوم پرورانہ ہوتا جاتا ہے - ادھر قبل از جنگ اور دوران جنگ کی پان اسلامی تحریکیں اور سنہ ۲۱ - ۲۰ ع کی تحریک خلافت سے اردو شاعری بے حد متاثر ہوتی ہے اور 'اقبال' کی سرکردگی میں اسلامی قومیت کے سپاہی اردو ادب پر چڑھ آتے ہیں - بایں ہمہ مسلمان نوجوانوں کا ایک طبقہ ملکی تحریکوں کا ہمدرد اور موئید ہے اور 'جوش ملیح آبادی' 'سیماب اکبر آبادی' اور 'ساغر نظامی' وغیرہ ان جذبات سے متاثر ہوے ہیں - عدم تعاون کی ناکامیابی کے بعد ملک میں کئی سال تک جمود کی سی کیفیت رہتی ہے - نوجوانوں کا ایک طبقہ مستقبل سے ہراساں ہوکر یا تو انگریزوں پر بم پھینکنا چاہتا ہے یا طرب و نشاط میں اپنی کلفتوں کو بھول جانا چاہتا ہے - اس دور کی بعض ہنگامی تصنیفیں اور اردو اور ہندی شاعری کی رومانی تحریکیں اس جذبۂ شکست کو ظاہر کرتی ہیں - گاندھی جی کے عدم تشدد اور انقلاب پروروں کے نظریۂ تشدد میں تصادم ہو رہا ہے جس کا عکس ہم ایک طرف کناڑی کے مشہور شاعر 'اناگولا' اور گجرات کے سحر طراز قومی

شاعر 'اردشیر خبردار' کی ستیاگرھی نظموں اور دوسری طرف شاعر انقلاب 'قاضی نذرالاسلام' کے ھنگامہ پرور کلام میں دیکھہ سکتے ھیں - سنہ ۲۵ ع کے بعد سے عوام کی خفتہ روح بھی جاگ رھی ھے اور مزدوروں اور کسانوں نے سیاسی جدوجہد میں حصہ لینا شروع کردیا ھے - متوسط طبقے کے کچھہ لوگ ان کے حقوق اور مطالبات کی تائید کررھے ھیں اور اسی طرح دور جدید کے ادب میں صرف یہی نہیں کہ ان کی حالت کیا ھے بلکہ کہیں کہیں یہ بھی دکھلانے کی کوشش کی جارھی ھے کہ انہیں کیا کرنا چاھیے - 'پنڈت دیوندر ستیارتھی' نے بہت بڑے پیمانے پر دیہاتی گیتوں کو جمع کرنے کا کام شروع کر رکھا ھے - ادھر 'ٹیگور' 'شرت چندر چٹرجی' اور 'پریم چند' ان برائیوں کا حل 'اصلاح' کو سمجھتے ھیں اور سرمایہ داروں اور زمینداروں سے رحم و کرم کی توقع رکھتے ھیں تاکہ وہ کسانوں اور مزدوروں کے ساتھہ ایک ھی گھاٹ پانی پی سکیں - کچھہ عرصے سے اشتراکیت اور انقلاب کی تحریکوں کی مقبولیت اور اصلاحی جدوجہد کی ناکامی نے ھر زبان میں ایسے ادیب پیدا کردیے ھیں جو نظام معاشی کی صحت کے لیے سرمایہ داری کی تباھی کو ضروری سمجھتے ھیں - اس ضمن میں ھم مرھٹی کی چندر لوک (چاند کی دنیا) اور بنگلہ کی 'شرمک گان' (مزدوروں کا گیت مصنفہ منصور احمد) کے نام لے سکتے ھیں —

بہر حال یہ تو ظاھر ھے کہ دور جدید کا ادب بڑی حد تک زندگی کا ترجمان ھے اور غزل جیسی داخلی صنف کا زوال اور نظم جیسی واقعیاتی صنف کی مقبولیت اس بات کی دلیل ھے کہ اردو کا ادیب جذبات و خیالات میں ارتباط قایم رکھنا اور ادب کے ذریعے زندگی کی خدمت کرنا چاھتا ھے - اب دیکھنا یہ ھے کہ ادب کے یہ نئے رجحانات زندگی کو منزل

مقصود کی طرف لے جا رہے ہیں یا نہیں اور اگر ان میں کمی ہے تو وہ کس طرح دور ہو سکتی ہے - ہم اپنی سہولیت کے لیے اس دور کے کچھ بڑے شاعروں اور ادیبوں پر زیادہ وضاحت سے نظر ڈالیں گے اس اعتبار سے کہ یہ لوگ کن مختلف ادبی تحریکوں کے پیشوا ہیں —

رجعت اور ٹیگور

حرفتی تہذیب پرانی بنیادوں کو تہ و بالا کر کے زندگی میں خلا پیدا کر دیتی ہے - خاندان کا شیرازہ منتشر ہو تا جاتا ہے، دیہاتوں کی خود اطمینانی ختم ہوتی اور شہروں کی ہنگامہ پروری ان پر حاوی ہوتی جاتی ہے - سرمایہ داری پرانے بندھنوں کو توڑ کر نئی راہوں کو بھی بند کر دیتی ہے - بچہ اگر بڑھ کر بالغ ہو گیا تو اس کی پوشش کے لیے نئے کپڑوں کی ضرورت ہے - پرانی تھگلیوں میں لپیٹا گیا تو یا تو اس کا دم گھٹ جائے گا یا کپڑا پھٹ جائے گا - لیکن سادہ لوح والدین اس کش مکش سے گھبرا کر کپڑوں کی قید سے اسے آزاد کرنے کو ہی مصلحت وقت سمجھتے ہیں - یہی حالت ان مفکرین کی ہے جو راہ ترقی کی دشواریوں سے بچنے کے لیے رجعت کی کلہاڑی سے دنیا کے پیر کاٹنا چاہتے ہیں —

طالسطائی پر تنقید کرتے ہوے 'لینن' ایک جگہ لکھتا ہے کہ " اس کی قوت تخلیقی اور جدت طبع بظاہر سرمایہ داری کے مظالم پر نکتہ چینی کرتی ہے - حکومت کے استبداد اور عدالت کی انصاف کشی پر اس کا دل غم و غصہ سے لبریز ہے - تہذیب کی فتوحات کے ساتھ جس طرح غریبوں کے خون سے دولت کے ایوان کھڑے ہوتے ہیں وہ ان سب کا جائزہ لیتا ہے - لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ بانگ دہل ہے جو یہ مجذوب تشدد کے مقابلے میں عدم تشدد کی حمایت میں بلند کرتا ہے - طالسطائی میں مظالم کے خلاف نفرت ہے، کسی روشن مستقبل کی تمنا ہے 'ماضی' کی پابندیوں سے

آزاد ہونے کی جد و جہد ہے لیکن ساتھ ساتھ اس کا تصور ابھی خام ہے، شعور سیاسی کی کمی ہے اور تغیر پسندی سے جھجک ہے۔" —

قبل از انقلاب - فرانس اور روس کے ادبا اور مفکرین نظام زندگی کی بد علوانیوں کی عقدہ کشائی کرتے رہے لیکن جب کسی نے آگے بڑھ کر اس کے عملی سد باب کی تدبیر بتائی تو یہ حواس باختہ ہوکر تصوف اور روحانیت کے حجروں میں جا چھپے - ہندوستان میں بھی یہی ہو رہا ہے اور ٹیگور کو ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر سکتے ہیں -

شاعر سوال کرتا ہے کہ "کوی کی کائیے، کی شنا ہے ؟ - شاعر تو کہا گائے گا کہا سنائے گا ؟ اور خود ہی جواب دیتا ہے : "دنیا میں جب سب لوگ بر سر کار تھے، اکیلا تو آوارہ لڑکوں کی طرح بھاگ کر میدان میں آیا اور بھری دوپہر میں غم دیدہ درختوں کے سایے میں بیٹھ کر دن بھر بانسری بجاتا رہا - للہ اب تو اٹھ جا -

آگ کہاں لگی ہے ؟ دنیا کو بیدار کرنے کے لیے کون صور پھونک رہا ہے - کسی کی فریاد سے فضا گونج رہی ہے ؟ کس قید خانے میں پا بہ زنجیر دکھیاری مدد کی طلب گار ہے ؟

لا تعداد بے بسو کے سینوں کا خون توہین انسانی کو غسل دے رہا ہے - خود غرضی درد انسانی پر ہنس رہی ہے - وہ بے زبان جو سرنگوں کھڑا ہے - جس کے اترے ہوئے چہرے پر صدیوں کے مظالم کی داستان کندہ ہے، جو جیتے جی ہر قسم کے بار کو اٹھائے چلتا ہے اور پشت در پشت اس بار مصائب کو ورثے میں چھوڑ جاتا ہے — وہ قسمت کا گلہ گزار نہیں ہے، نہ دیوتاؤں کو کوستا ہے اور نہ انسان کی شکایت کرتا ہے - جو کام کرنے کے لیے زندہ رہتا ہے اور زندہ رہنے کے لیے دو مٹھی اناج کے سوا کچھ نہیں

چاہتا اور جب اس مایۂ حیات کو بھی کوئی چھین لیتا ہے، جب کوئی فرعون اس کے اس اثاثہ پر بھی دست درازی کرتا ہے تو وہ بد بخت غریبوں کے خدا کو پکار کر جان دے دیتا ہے —

اسی حسرت نصیب کو قوت گویائی بخشتا ہے - اس کے ٹوٹے ہوئے دل میں امید کا دیا جلاتا ہے - اسے پکار کر کہتا ہے کہ چشم زدن کے لیے سر بلند ہو جا اور پھر دیکھ کہ جس ظالم کے خوف سے تو لرزہ بر اندام ہے وہ تجھ سے کہیں زیادہ بزدل ہے - جیسے ہی تو جاگے گا وہ راہ فرار اختیار کرے گا - تیرے سامنے آتے ہی وہ راستے کے کتے کی طرح دم ہلانے لگے گا - خدا اس کا دشمن ہے، وہ بے یار و مددگار ہے، اس کی چرب زبانی پر نہ جا - وہ دل ہی دل میں اپنی ذات پر نادم ہے —

اے شاعر، اگر تیرے دل میں ذرا بھی احساس ہے تو اسے اپنا ہمنوا بنا اور اپنی زندگی اس پر قربان کر - غم و اندوہ کی انتہا نہیں اور اس سیاہ خانے کی تاریکی اور الم نصیبی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے - روٹی، زندگی اور روشنی کی ضرورت ہے - صحت، غم اور آزادی سے دنیا کو مالا مال کرتا ہے - اے شاعر، افلاس کی طغیانی میں ایک مرتبہ جنت کے ہوشربا نظاروں کے دروازے کھول دے -" (ماخوذ از چترا)

سرمایہ دارانہ تمدن کے خلاف اپنی مشہور نظم 'وسوندھر' (زمین) میں کہتا ہے :—

"یہ حیاسوز خون کی پیاسی بربریت کسی دین و آئین کی قائل نہیں اور نہ کسی رسم و رواج کی پابند ہے - اسے فکر فردا ہے اور نہ فکر امروز - اس کی زندگی سمت و ساحل سے بے خبر ہو کر دیوانہ وار بھاگ رہی ہے - نہ وہ ماضی کی طرف دیکھتی

ہے اور نہ مستقبل کی پروا کرتی ہے - 'آج' کی موجوں پر آوارگی اور حباب آسا مسرتوں کو نچاتی ہوئی وہ اس بے حقیقت ناؤ کی طرح رواں ہے جو اپنا ہر بادباں کھولے کسی راہ بے منزل کی طرف جا رہی ہو' —

لیکن بجائے اس کے کہ وہ ان تعلقات کی بربادی کا آرزو مند ہو جو انسان کے لیے آتش زیر پا بن گئے ہیں وہ پیداوار کے تمام جدید ذرائع کو مٹا کر دور وحشت کی طرف لوٹ جانا چاہتا ہے - تہذیب سے خطاب' نامی نظم میں کہتا ہے: "اے نئی تہذیب' مجھے وہ پرانے دشت و جبل لوٹا دے اور اپنے اس شہر کو— اس لوہے' پتھر اور لکڑی کے مقبرے کو واپس لے لے۔ اے انسانیت سوز تہذیب لئیم' ایک بار پھر وہ عبادت کاہ مجھے لوٹا دے جس کا سایۂ عاطفت نیکی کا گہوارہ تھا ... میں آزادی چاہتا ہوں' اپنے بازوؤں کو پوری طرح پھیلانا چاہتا ہوں- اپنے سینے میں پھر ان کھوے ہوے جذبات کو جگہہ دینا چاہتا ہوں اور تمام پابندیوں کو توڑ کو اپنے دل کو اس دنیا کا آئینہ بنانا چاہتا ہوں' —

ٹیگور کا کوئی ادبی کارنامہ حال اور ماضی کے اس تنازع سے خالی نہیں ہے - زمانۂ حال سے اسے سخت نفرت ہے' سرمایہ دارانہ تمدن کا وہ گلہ گزار ہے - یہ تمدن مادی مطالبات سے روح کو گراں بار ہی نہیں کر رہا ہے بلکہ اس کے وجود سے انسان کو بے پروا بنا رہا ہے - زندگی ابد تک وسیع کیا ہوتی بلکہ 'آج' اور 'ابھی' کی ایک ساعت میں سمٹ رہی ہے - ٹیگور: یہ خوب سمجھتا ہے کہ نظام معاشی کی افراتفری نے ہی یہ ستم برپا کیا ہے - روس کی سیاحت کے اثنا میں وہ پروفیسر پیٹروف کو لکھہ چکا ہے کہ روس کی اس ترقی کا راز یہ ہے کہ وہاں دولت پر کسی ایک

طبقے کا نہیں بلکہ پورے سماج کا قبضہ ہے - تاہم اپنے ملک کے مسائل کا کوئی حل اس کی سمجھ میں نہیں آتا سوا اس کے کہ لوگ جنگلوں اور پہاڑوں میں تصوف کی الجھنوں کو سلجھاتے رہیں - امید و بیم کے دو متضاد جذبات اس کے کلام میں جا بجا ملیں گے - انسانیت کے مستقبل پر اس کا ایمان ہے لیکن تغیر کب اور کیسے ہوگا یہ وہ نہیں بتا سکتا - یہ رنگ عمر کے ساتھ زیادہ نمایاں ہوتا جاتا ہے اور 'سونار تری' (سنہری کشتی) میں جس نامعلوم منزل کا پتا دریافت کیا گیا تھا شاعر اپنے آخری مجموعہ 'بلاکا' میں بھی اسی کی تلاش میں سرگرداں ہے: "جو دریاے زندگی میں اتر چکا وہ ساحل کی پروا کیوں کرے؟ کشتی کا آسرا کیوں ڈھونڈے؟ ناخدا کا احسان کیوں اٹھاے؟ اس کارواں کی کوئی منزل مقصود نہیں، نہ وہ کہیں ٹھیرتا ہے، اور نہ کہیں آرام لیتا ہے - راہ میں کہیں دم بھر آرام لیے بغیر وہ اس راستے پر چلتا رہتا ہے جس کا اور چھور نہیں ملتا" —

اس کی اکثر نظمیں اس فقدان مقصد کو ظاہر کرتی ہیں مثلاً:
"انسان کی وہ آوازیں میرے کان میں گونج رہی ہیں جو کہر آلود ماضی سے نکل کر بعید از فہم ابد کی طرف کسی نا معلوم رستے سے سفر کرتی جا رہی ہیں - اور اپنے دل میں اس آشیاں بدر پرندے کی فریاد سنتا ہوں جو لاتعداد پرندوں کے ساتھ اس دھوپ چھانو سے نکل کر معلوم نہیں کہاں سے کہاں جا رہا ہے - اس کا یہ نغمہ فضا کو مترنم کردیتا ہے کہ یہاں نہیں' کہیں اور' کہیں اور' کسی دوسری جگہ —"

راہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے شاعر کی جستجو ناکام رہ جاتی ہے اور وہ تصوف کے الجھیڑے میں الجھ کر انجام کار حزنیت کا شکار ہو جاتا

ہے - چنانچہ اس کی پچھلی نظموں میں سے اکثر موت 'عدم' فنا اور پیری کا نوحہ سناتی ہیں - وہ ٹیگور جس نے بنگال کی سودیشی تحریک سے متاثر ہوکر لکھا تھا کہ "اگر تیری پکار سن کر کوئی نہیں آتا تو نہ سہی تو اکیلا ہی بڑھا چل" — جس کے ولولہ انگیز نغمے نے انقلاب پروروں کو دار و رسن پر امید کا چراغ دکھلایا تھا — "اگر رات اندھیری ہے اور کوئی راستہ نہیں دکھاتا تو اپنے سینے کی ہڈیوں کو مشعل راہ بنا اور اکیلے ہی چلا چل" — اس کا جسم ہی نہیں روح بھی بوڑھی ہوچکی اور اس کا پچھلا مجموعۂ کلام اس کی بے راہ روی کا افسانہ ہے —

گاہے گاہے ٹیگور رفارمر کی صورت میں بھی نظر آتا ہے - "گورا" اور "کمدنی" نامی ناولوں میں سماج کی ناپاکیوں کو دکھانے کے بعد وہ تعلیم یافتہ طبقے سے انصاف اور اصلاح کی اپیل کرنے لگتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نظام میں بنیادی تبدیلیوں کے بغیر برائیاں دور ہوسکتی ہیں — غریبوں میں وہ نمک حلالی اور ایمان داری کے جذبات پیدا کرنا چاہتا ہے اور امیروں کو رحم دلی اور انصاف پروری کی تلقین کرتا ہے - اپنی ایک نظم "بوڑھا نوکر" میں اس ملازم کا تذکرہ رو رو کر کرتا ہے جو لاکھہ تکلیفیں جھیل کر بھی اُف نہیں کرتا اور مالک کو خدا مانتا ہوا اس کی چوکھٹ پر مرجاتا ہے -

بہر نوع جہاں تک استعمار کا سوال ہے 'ٹیگور' اس کا مخالف ہے - بعد ازآں اس کے پیغام میں ثنویت (Dualism) پیدا ہو جاتی ہے- سرمایہ دارانہ تمدن کو وہ سرمایہ دارانہ نظام کا نہیں بلکہ مشینوں کے رواج کا لازمی نتیجہ سمجھہ کر اس سوچ میں پڑجاتا ہے کہ آگے چلوں یا پیچھے بھاگوں - اور جب ملوکیت کو فنا کرنے کے لیے اس سے عملی تدبیریں دریافت کی

جاتی ہیں تو وہ اصلاح، عدم تشدد اور تصوف کی تبلیغ کرنے لگتا ہے - تاہم ٹیگور کے کلام کا بڑا حصہ ادب جدید کے لیے قابل قبول ہے اور یہ خیال بڑی حد تک غلط ہے کہ وہ عمل کا دشمن ہے - ٹیگور ہر گام پر پیام عمل سناتا ہے اور اس لحاظ سے اپنے معاصرین سے کہیں بلند اور قابل احترام ہے کہ اس کا پیغام کسی خاص دور یا مخصوص جماعت کے لیے نہیں ہے - اس کا نقطۂ نظر بین الاقوامی اور زمان و مکان سے بالاتر ہے —

اکبر الہ آبادی مرحوم رجعت اور قدامت کے سب سے بڑے علم بردار گزرے ہیں اور ان کا طنز از آغاز تا انتہا مغرب پرستی کے ماتم سے بھرا پڑا ہے - یہ ان بوڑھے والدین کے شاعر ہیں جن کا تمدن دیسی جوتی، پگڑی اور اچکن تک محدود ہے اور جن کا مذہب چھکڑوں پر چل سکتا ہے، ریل گاڑی سے اسے بعد ہے ! یہ سامنتی تمدن کا شدید احتجاج تھا جو طنزیہ تک بندی میں کفر کے فتوے صادر کر رہا تھا - یہ کہنا لا حاصل ہے کہ یہ ادبی رجحان عام تھا جو نئی روشنی اور پرانی روشی کے اس تنازع کا پرتو ہے جو اب بھی ہر ہندوستانی خصوصاً ہر مسلمان خاندان میں شد ومد کے ساتھ جاری ہے - سامنتی تمدن مغربیت کے نرغے سے نکلنے کے لیے نئی نئی ترکیبیں سوچتا ہے - کبھی وہ انگریزی تعلیم کا یک لخت مخالف ہو جاتا ہے اور کبھی ملازمتوں کی لالچ سے یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ مغرب سے اچھی اچھی چیزیں لے لی جائیں - چنانچہ ہمارے ادبا کا ایک گروہ اب اس حد تک صلح کرنے پر تیار ہے کہ مشرق و مغرب یعنی سامنتی اور حرفتی تہذیبوں میں میل کرا دیا جائے - اس لچر نظریہ کی مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ ہنوز ہمارے ملک میں سامنتیت کے کھنڈر باقی ہیں اور صنعت و حرفت کو وہ فروغ نصیب نہیں ہوا جو ملوکیت سے آزاد ہوکر ہی حاصل

ہو سکتا ہے - بہر حال ، ٹیگور ، اقبال ، جوش اور اردشیر خبردار جیسے استعمار دشمن شاعروں نے بھی ' مشین ' اور ' مشین کے مالک ' کے امتیاز کے سمجھنے میں غلطی کی ہے اور تقسیم کی بے علوانی سے تنگ آکر پیداوار کے ذرایع کو مٹا دینا چاہتے ہیں - جو غلطی سیاسی میدان میں گاندھی جی اور دوسرے سامنتی رہنما کر رہے ہیں ، اس کا اعادہ دنیائے ادب کے یہ اکابر بھی کر رہے ہیں - ظاہر ہے کہ ان جذبات کی مقبولیت مادی اعتبار سے دنیا کو پیچھے لے جائیگی کیونکہ تہذیب کے مستقبل کا انحصار قدرت اور انسان کی جنگ کے نتیجے پر ہے - اس لیے یہ نظریہ انسان کی شکست اور پسپائی کا اعلان ہے —

فاسیزم (fascism) اور اقبال —

اقبال کا نظریۂ زندگی بڑی حد تک اس تحریک سے متاثر ہے جس کے بانی ' جمال الدین افغانی ' تھے - مشرق نے مغربی استعمار کی چیرہ دستیوں کے خلاف جو احتجاج شروع کیا اور یورپ میں نیشٹا ، برگساں اور مہزنی نے حرفتی تہذیب پر جو اعتراضات کیے اقبال ان سے بھی اثر پزیر ہوا - وہ اسلام کے نام پر ایک تصور عالم پیش کر رہا ہے اور اس کی رائے میں مسائل زندگی کا واحد حل یہ ہے کہ دنیا اس تصور کو عملی جامہ پہنائے - یہاں میں صرف یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ اقبال فاسطیت کا ترجمان ہے اور یہ درحقیقت زمانۂ حال کی جدید سرمایہ داری (neo-capitalism) کے سوا کچھہ نہیں ہے - ظاہر ہے کہ فاسیزم پر کوئی جامع بحث اس مضمون کے احاطے سے باہر ہے لیکن اگر ضرورت ہوئی تو اپنے تجزیہ کی تائید میں بعد از آں ثبوت پیش کروں گا —

سلطنت (State) بجائے خود کوئی منتہا نہیں بلکہ سماج کے تعلقات انسانی کی محافظت کا ایک آلہ ہے اور چونکہ ان تعلقات کا انحصار ذرائع پیداوار کی ملکیت

پر ہے اور وہی طبقہ سماج میں برسر اقتدار ہوتا ہے جس کے ہاتھہ میں کلید ملکیت ہے لہذا سلطنت، تہی دست طبقے کی پامالی کے لئے ' طبقۂ غالب ' کی انجمن کارساز ہے - ارتقائے انسانی کے لئے ضروری ہے کہ زمام سلطنت اس طبقے کے ہاتھہ میں رہے جو پیداوار کے ذرائع کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے - سرمایہ دارانہ نظام نے یہ فایدہ ضرور پہنچایا کہ سامنتی سماج کی بنیاد کو فنا کر کے مشینوں کے رواج کو عام کر دیا - لیکن اس کی عمر طبیعی اسی روز ختم ہوگئی جب وہ پیداوار اور اس کی تقسیم میں ارتباط قائم نہ کرسکا - کیونکہ دور حرفت اجتماعی پیداوار کا زمانہ ہے اس لئے ضروری ہوگیا کہ پیداوار کے ذرایع پر چند لوگوں کی ملکیت نہ ہو بلکہ پورا سماج اس کا مالک اور منتظم ہو - یہ تبھی ممکن ہے جب وہ محنت کش طبقہ سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھہ میں لے جو اقتصادی قالب کو اس طریقے سے بدل سکتا ہے - سرمایہ داری انحطاط پزیر ہوتی جاتی ہے اور اپنے کو زندہ رکھنے کے لیے وہ نئے حیلے تراشتی اور نئے معاونین تلاش کرتی ہے -

مشین نے معاشیات کو قوم و ملک کی حدود سے نکال کر بین الاقوامی بنا دیا ہے اور اب اس کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ قومی حکومت کی پابندیاں توڑ دی جائیں اور مالیات و سیاسیات میں امتزاج پیدا ہو جائے - لیکن وطنی سرمایہ داروں کی جماعتیں یوں خودکشی نہیں کرسکتیں - بین اقوامیت کے چڑھتے ہوے دریا کو روکنے کے لئے وہ نئی دیواریں باندھنے لگتے ہیں - وہ کہنے لگتے ہیں کہ ہمارا ملک یا ہماری قوم یا ہمارا مذہب یا ہماری نسل دنیا میں سب سے زیادہ افضل اور اکمل ہے - اطالیہ قدرت کی طرف سے دنیا کے نام ایک خاص پیغام لایا ہے ! جاپانی برگزیدہ بندے ہیں، جرمن خدا کی بہترین مخلوق ہیں ! وہ اپنا فرض اسی حالت

میں ادا کرسکتے ہیں کہ آپس کی خانہ جنگیاں بند ہوں - رعایا کا ہر فرد عام اس سے کہ وہ سرمایہ دار ہے یا مزدور صرف ایک حاکم کا اطاعت گزار ہے - ہیگل اور اس کے جرمن متاخرین سلطنت کو اس تصور (Idea) کی تعبیر بتاتے ہیں جس کے حصول کے لیے سماج ارتقا بالضد کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے- پارلیمینٹری نظام حکومت صرف اس حالت میں قابل قبول تھا جب تک مالیات میں عدم مداخلت (laissefaire) کے اصول پر عمل ہوسکتا تھا - لیکن اب مزدوروں کی تحریک کو کچلنے اور ساتھ ساتھ سلطنت میں یک جہتی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ جمہوریت کو فنا کر کے ڈکٹیٹری قائم کی جاے - ڈکٹیٹر ایک انسان برتر ہے جو ہر طبقے کے ساتھ انصاف کرتا ہے جو ہر قسم کے طبقاتی اور نسلی تعصب سے بالا ہے - وہ سرمایہ داری کی سرکوبی کرتا ہے اور مزدوروں کو ' انتہا پسندی ' کی طرف نہیں جانے دیتا ! پھر اس کا وطن دنیا کا پیشوا ہوگا' اس لئے وہ قومی اور وطنی تہذیب کا نگہبان بھی ہے ! اشتراکیت میں وطنیت ' قومیت اور روحانیت کے لئے جگہہ نہیں ہے اور چونکہ متوسط طبقے کو ان چیزوں سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے ' اس لیے وہ ہمیشہ ان کی دوہائی دیا کرتا ہے - اس طبقے کے نوجوان پرناسیست حکومت کے پشت پناہ ہیں —

اقبال ایک قوم کو ہی نہیں بلکہ اس قوم کے ایک خاص طبقے کو مخاطب کرتا ہے - یہ طبقہ نوجوانوں کا ہے - تاریخ اسلام کا ماضی اسے بہت روشن اور شاندار معلوم ہوتا ہے - اس کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا دور فتوحات اسلام کے عروج کی دلیل ہے اور ان کا زوال یہ بتلاتا ہے کہ مسلمان اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں - حالانکہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ اسلام کی ابتدائی فتوحات عرب ملوکیت کی فتوحات نہیں تھیں

اور تاریخ کے کسی دور میں کبھی اسلامی تصور زندگی پر عمل بھی ہوا تھا - بعد از آں، مسلمانوں نے جو کچھہ کیا وہ قطعاً غیر اسلامی تھا - اور ممکن ہے کہ وہ روحانی اعتبار سے مسلمان ہوں لیکن اسلام کے سماجی تصور سے انھیں کچھہ زیادہ واسطہ نہ تھا - بہر حال، وطنیت کا مخالف ہوتے ہوے بھی 'اقبال' قومیت کا اس طرح قائل ہے جس طرح 'مسولینی' - اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ ایک کے نزدیک قوم کا مفہوم نسلی ہے اور دوسرے کے نزدیک مذہبی - فاسسٹوں کی طرح وہ بھی جمہور کو حقیر سمجھتا ہے :

متاعِ معنئی بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی
زِموراں شوخیٔ طبعِ سلیمانی نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

(جمہوریت از پیام مشرق)

فاسزم اور اشتراکیت میں ایک فرق یہ بھی ہے، کہ جہاں اول الذکر عوام کو پیدایشی خر بتاتا ہے، وہاں اشتراکیت ان کی کم فہمی کو ماحولی سمجھتی ہے اور بنا بریں اس ماحول کو بدلنے کی ضرورت اور بھی بڑہ جاتی ہے- فاسزم کا ہمنوا ہوکر وہ اشتراکیت اور ملوکیت دونوں کی مخالفت کرتا ہے-

ہر دو را جانِ ناصبور و ناشکیب ہر دو یزداں ناشناس، آدم فریب
زندگی ایں را خروج، آں را خراج درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل ہر دو را تن روشن و تاریک دل

(اشتراکیت و ملوکیت از جاوید نامہ)

ملوکیت و سرمایہ داری کا وہ اس حد تک دشمن ہے جس حد تک متوسط طبقے کا ایک آدمی ہوسکتا ہے - بندہ اور بندہ نواز کی تفریق

بظاہر مٹ جاے اور محمود و ایاز ایک صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ لیں !

مشینوں کا رواج انسانیت کے لیے مضرت رساں ہے :

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

درآں حالیکہ آلات خود کچھ نہیں کرتے ' بلکہ وہ مخصوص حالات مروت کو کچل دیتے ہیں جن میں ان سے کام لیا جاتا ہے - آلات تو مال پیدا کر دیتے ہیں ' اب یہ انسان کا کام ہے کہ اس کی تقسیم مناسب طریقے سے کرے - 'اقبال' مزدوروں کی حکومت کو چنداں پسند نہیں کرتا —

زمامِ کار اگر مزدوروں کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

ہوس اندر دل آدم نہ میرد همان آتش میانِ هر زغن هست
عروس اقتدار سحر فن را همان پیچاک زلف پرشکن هست
نماند ناز شیریں بے خریدار اگر خسرو نباشد کوہکن هست

(از پیام مشرق)

سرمایہ داری اور ملوکیت کی موجودہ بنیادوں کو مٹا کر نظام معاشی کو از سر نو قائم کرنے کے لیے 'اقبال' ایک تصور عالم پیش کرتا ہے - لیکن ایک بین اقوامی تصور کا عامل اس کے نزدیک ایک بین اقوامی طبقہ نہیں بلکہ ایک قوم ہے جس میں ایک بہت بڑا گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو 'اقبال' کی نظر میں بھی مسلم نما کافر ہیں اور اس کی تحریک کے سب سے بڑے مخالف یہی لوگ ہوں گے - اپنے خواب کی تعبیر اطالوی فاسیسٹ میں دیکھ کر وہ جوش سے کہتا ہے :

رومتہ الکبرا ! دگرگوں ہوگیا تیرا ضمیر
اینکہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب

چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجواں ہیں تیرے سوز آرزو سے سینہ تاب
یہ محبت کی حرارت ! یہ تمنا ! یہ نمود !
فصل گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب
نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے
زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب
فیض یہ کس کی نظر کا ہے ؟ کرامت کس کی ہے ؟
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب

(مسولینی از بال جبرئیل)

یہ فیض 'مسولینی' کا ہے جو اطالیہ کی بہبودی کے لیے ساری دنیا کو فنا کرسکتا ہے ' جو اطالیہ کے سرمایہ داروں کا سپہ سالار ہے ' جو جنگ کو انسانیت کے لیے شیرِ مادر بتاتا ہے - 'اقبال' ایسے ڈکٹیٹر کو ہی اسلامی پاکستان کے استحکام کا ضامن سمجھتا ہے - خلافت کا تصور اس کے نظرے کی تائید کرتا ہے حالانکہ 'خرانِ جمہور' میں وہ 'طبع سلمانی' کہاں جو اس ڈکٹیٹر کو 'مشورہ' دے سکے —

مختصر یہ کہ 'اقبال' اسلامی فاسیت ہے اور اس کا رد عمل بھائی پرمانند اور ڈاکٹر منجے کے ہندو فاسیزم کی صورت میں ظہور پزیر ہو رہا ہے جن کے نزدیک ویدک عہد کی تہذیب انسانیت کی معراج ' اور ذات پات کی تقسیم ' تقسیم عمل کا بہترین نمونہ ہے !

ادب اور قومیت

ہندو مسلم نفاق در اصل دو مختلف تہذیبوں کی کش مکش ہے اور ہم دیکھ چکے کہ کس طرح 'ٹیگور' اور 'اقبال' اپنا تصور عالم پیش کرکے ان متضاد رجحانوں کو ظاہر

کر رہے ہیں - سیاسی اغراض کی خاطر ہر دو قوم کے متوسط طبقوں میں باہم اتحاد اور امتزاج کی جو تحریک شروع ہوئی تھی وہ بھی ادب ہند پر ایک نقش چھوڑ گئی ہے اور دونوں قوموں کے کئی ادیب خالص وطنی اور قومی جذبات سے متاثر نظر آتے ہیں - وہ ہندوستانیوں کو ترغیب دیتے ہیں کہ خانہ جنگیوں کو بند کرکے غیر ملکی حکومت کے خلاف اپنا محاذ قائم کریں - ان کے نزدیک وطن سب کچھ ہے - وہ یہ بھی نہیں سوچنا چاہتے کہ آئندہ حکومت کا دستور کیا ہوگا - بس انگریزوں کے جاتے ہی کوئی جادو کی چھڑی ہر معاملے کو درست کردے گی گویا سماج کی تمام برائیاں صرف ان سے وابستہ ہیں - ظاہر ہے کہ اب تک جو سیاسی تحریکیں اس ملک میں اُٹھ اُٹھ کر گرتی رہیں وہ اس قوم پرورانہ جذبے سے متاثر تھیں جس کے پیچھے دیسی سرمایہ دارانہ مفاد کام کر رہے تھے - اردو میں 'چکبست' 'جوش' اور 'ساغر نظامی' ہندی میں 'نوین' ایک 'بھارتیہ آتما' اور 'بابو میتھلی شرن گپتا' انگریزی میں 'سروجنی نائیڈو' اور 'ہرین چٹرجی' گجراتی میں 'اردشیر خبردار' اور دکن میں 'اناگولا' اس قومی رجحان کے ترجمان ہیں - ہندو مسلم تفریق کو مٹا کر ایک قوم کو جنم دینے اور ہندی اور اردو کی آمیزش سے ایک زبان وضع کرنے کا بھی سامان ہو رہا ہے - چنانچہ صرف نثر میں ہی نہیں بلکہ نظم میں بھی اردو والے ہندی کے اور ہندی والے اردو کے بکثرت الفاظ مستعمل کرنے لگے ہیں - تحریک اتحاد کے بعد ہی اردو میں ہندی گیتوں کی مقبولیت ہوئی اور ہندی میں مشہور شاعر 'ہری اودھ' کی تھیٹ ہندی کو قبول عام میسر آیا - ان کے چوپدے پڑھیے تو بہ اعتبار زبان وہی لطف آتا ہے جو 'آرزو لکھنوی' کی خالص اردو میں —

قومی تحریک کا سب سے بڑا شاعر شاید ''اردشیر خبردار' ہے - گجرات میں آج اس کا وہی مرتبہ ہے جو اردو میں اقبال کا اور بنگالہ میں 'ٹیگور' کا - وہ کوئی ہنگامی شاعر نہیں بلکہ قومیت کے نظریے کی تہہ تک پہنچتا ہے اور اس کا مجموعۂ کلام 'درشنکا' (فلسفہ) بمبئی یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے - اس کا ترانہ 'گنونتی گجرات' اقبال کے ترانے یا ڈی - ایل - رائے کے 'بنگ آمار لچھمی بھومی' سے کم مقبول نہیں ہے - وہ سخت قسم کا وطن پرست اور قوم پرور ہے - اپنی ایک نظم میں کہتا ہے —

"اے مادر وطن ! روز آفرینش سے جس کے خوابوں کا ہار تیرے تاروں سے گوندھا گیا ہے —

جو مرتے دم تک تیرے ہی نام کو بوسے دیتا ہے -

اے ماں، اُس نے تجھے پہچان کر اپنی خودی کو سمجھا ہے -

جب میں مرجاؤں تو تیری خاک پاک سے دوبارہ جنم لوں تاکہ تجھہ پر دوبارہ قربان ہوسکوں - تیری مٹی میرے لیے مایۂ حیات ہے' کیونکہ خالق کے پرستار کی مٹھی میں تمام مخلوق ہے" —

ایک دوسری نظم میں ستیاگرہ کی تبلیغ یوں کرتا ہے : " آج اپنے ساتھہ کیا کیا لوگے ؟ جرأت تلوار میں نہیں دل میں رہتی ہے - کاٹ تمہاری ہمت مردانہ میں ہے ورنہ ہر تلوار بے آب ہے - ان کند ہتھیاروں کو پھینک کر دل کو جنگ کے لیے مستعد بناؤ - ہمیں کسی کا خون نہیں بہانا ہے - حریف کے خون جگر سے ہم اپنے دل کے دیوتا کو کیوں کر ناپاک کریں - جس فتح کی تاریخ انسان کے خون سے لکھی جاتی ہے وہ بے پایاں ہے — "

ادب اور تحریک اصلاح

مغربیت نے اتنا فائدہ ضرور پہنچایا کہ ہمارے ارباب حل و عقد اپنی آنکھوں کے شہتیر کو دیکھنے

لگے - یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ان کی موجودہ زندگی کسی نہ کسی حد تک بے ربط ضرور ہے - چنانچہ ہندوؤں میں سماج سدھار' کی تحریک زور شور سے چل پڑی - سوشل معاملات میں کم عمری کی شادی' بیواؤں کی بدحالی اور مردوں کی تماش بینی کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں - گجرات میں گووندرام نے اور بنگال میں 'ٹھکور' اور 'شرت چند' نے اس تحریک کی حمایت میں افسانے لکھے - ادھر مسلمانوں کی ہر برائی بھی چونکہ برگزیدہ ہے اس لیے 'قاضی سرفراز حسین' اور 'راشد الخیری' نے چند پیش پا افتادہ مسائل پر اکتفا کیا اور ایک عرصے تک کسی کو جرات نہ ہوئی کہ ایک تیز نشتر لے کر اس ناسور کو دکھاے جس نے سماج کے رگ و پے میں زہر ساری کر دیا ہے - اس طرف دو کتابیں ایسی شائع ہوئیں جو قابل توجہ ہیں اور مسلمان تعلیم یافتہ جماعت میں ایک نئے رجحان کا پتا دیتی ہیں - انگارے' افسانوں کا ایک مجموعہ ہے جو اب ضبط ہو چکا - یہ افسانے ہماری جنسی زندگی کا مرقع تھے اور حالانکہ ان کا انداز تحریر جنسی تشدد سے متاثر تھا اور اس ذہنیت کا آئینہ دار تھا جو روح یا پیٹ کی طرح محض جنس ہی کو واحد شعبۂ زندگی قرار دیتی ہے' تاہم اردو افسانہ نگاری میں یہ پہلی مثال ہے کہ ادب نے منافقانہ پابندیوں پر اپنے فرائض کو ترجیح دی ہو - دوسری کتاب 'لیلیٰ کے خطوط' ہے - افسوس کہ اس کے مصنف نے مظلوم نسوانیت کا ترجمان ایک شاہد بازاری کو بنا کر اس مسئلہ کو محدود بنا دیا اور شہری زندگی میں طوایف کی ناگزیریت کو نظر انداز کر دیا ورنہ اس کتاب کا شمار ہندوستان میں دور جدید کی اچھی تصنیفوں میں ہوتا - تاہم اس کی مقبولیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس طبقے کے کچھ لوگ محض

اصلاح کو ہی کافی نہیں سمجھتے اور یہ بھی دیکھنے لگے ہیں کہ ان برائیوں کو دور کرنے کے لیے نظام زندگی میں بنیادی تبدیلی کرنی ضروری ہے -

اقتصادی مسایل میں طبقاتی تصادم (Class-war) کا مطلع صاف ہوتا جاتا ہے اور واقعیت نگار ادیب اس طرف بھی متوجہ ہونے لگے ہیں - 'پریم چندر' کے تقریباً سبھی کردار اصلاح پسند (Reformist) ہیں - اس کے سامنے ایسے خوش حال زمین داروں کی مثالیں ہیں جو 'طالسطائی' کے 'ڈسیٹری' (Resurrection) کی طرح کسانوں میں اپنی جائداد تقسیم کر کے اپنی زندگی کو خدمت خلق کے لیے وقف کر دیتے ہیں - عورتیں اپنے ڈربوں سے نکل کر مردوں کے دوش بدوش قومی زندگی کی تدوین میں حصہ لے رہی ہیں - 'سجان سنگھہ' 'پریم شنکر' اور 'ونیے کمار' اسی قسم کے نوجوان ہیں - 'سمن' 'گایتری' اور 'صوفیہ' ایسی ہی عورتیں ہیں - لیکن جب ایسے زمین دار مستثنیات میں شمار ہوتے ہیں اور اس کلیہ کو ثابت کرتے ہیں کہ اپنے حقوق سے کوئی طبقہ برضا و رغبت دست بردار نہیں ہوتا تو پریم چندر سوچ میں پڑ جاتا ہے اور راہ انقلاب کی آتش اندوزیوں سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں - طالسطائی اور ٹیگور کے نقش قدم پر چلتے ہوے وہ انقلاب اور رجعت کے دوراہے پر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر یہ کہتا ہوا بیٹھہ جاتا ہے کہ اے کاش اس رستے پر چلے بغیر ہم وہاں پہنچ جاتے ! -

اصلاح کی ہر تحریک نیک نیتی لیکن تنگ نظری پر مبنی ہے - زندگی اور موت میں اتحاد نہیں ہو سکتا اور نہ ظالم و مظلوم کو ایک لڑی میں گوندھا جا سکتا ہے - اسی طرح تعلقات جنسی میں اس وقت تک توازن، استحکام و صحت کی گنجائش نہیں جب تک زندگی کے دوسرے

مسائل سے ہم اسے الگ کرکے دیکھنے کی عادت نہ چھوڑ دیں اور ترغیبات جنسی کو شیطان کا غلبہ نہیں بلکہ ایک فطری جبلت (instinct) نہ سمجھنے لگیں —

ادب اور فقدان مقصد

پل صراط کی طرح انقلاب کا رستہ بھی بڑا دشوار گزار ہے - بہت سے لوگ راہ میں تھک کر رہ جاتے اور تصوف کی خندق یا نراج کی گھاتی میں گر پڑتے ہیں - ہندوستان ایک دورِ تغیر سے گزر رہا ہے اور تعلیم یافتہ طبقے کا ایک گروہ لازمی طور پر داخلی کش مکش میں مبتلا ہے - اس کے لیے زندگی کی حقیقت ایک رقص شرر سے زیادہ نہیں ہے - اس کی زندگی کا کوئی معیار یا مسلک نہیں ہے - ماضی اس کے لیے بے معنی اور مستقبل لا یعنی ہے - جو کچھ ہے 'ابھی' اور 'آج' کی مسرتوں میں ہے - شراب و شباب کا یہ فلسفہ پہلے بھی اس ملک میں مقبول تھا لیکن ہر جام کے ساتھ توبہ تھی اور ہر معصیت کے ساتھ احساسِ گناہ اور عفو گناہ کی امید - لیکن اب مستقبل کی تاریکی خود کشی کے رجحان کو بڑھاتی جاتی ہے اور باہمت بے راہ رَو بم پھینک کر' کم ہمت لوگ آپ اپنی جان لے کر اور آزاد منش 'خیام' 'بائرن' اور 'آسکر وائلڈ' کی قسمیں کھا کر اس نراجی ذہنیت کا ثبوت دے رہے ہیں - دنیائے ادب میں اس کا پر تَو رومانیت اور 'ادب برائے ادب' کی صورت میں آشکار ہوتا ہے - حقائق کی تلخ کامیوں سے گھبرا کر انگلستان میں 'بائیرن' اور 'کیٹس' وغیرہ نے سامنتیت کے زوال کے زمانے میں اور اب ییٹس (Yeats) اور ڈی - ایچ لارنس وغیرہ نے حرفت کے زوال کے وقت اسی جذبۂ شکست کا اظہار کیا ہے - ہمارے ملک میں بھی متوسط طبقہ میدانِ کارزار سے گھبرا کر تصوف اور رومانیت کی آڑ پکڑنے لگتا ہے - ہندوستان

کا سب سے بڑا ناول نگار 'شرت چندر چٹرجی اپنے ناول چرترھین' بداخلاق) شیش پرشن (آخری سوال) اور 'شری کانت' میں ایسے ھی لوگوں کی تصویر کھینچتا ھے - بنگلہ اور ھندی میں رومانیت اور ٹیگور سے اثر انداز ھو کر شاعری میں 'چھایہ واد' یعنی اشاریت (Symlolism کی تحریک شروع ھوئی اور حقیقت پرستوں کو ایک عرصے تک ان رجحانات کے خلاف برسرپیکار رھنا پڑا - اردو کے نوجوان شاعروں میں بھی یہ ذھنیت عام ھو گئی ھے اور یہ اصحاب حسن و عشق کے علاوہ دنیا کی ھر چیز سے بے نیاز نظر آتے ھیں' حالانکہ نہ ان کا عشق بوالھوسی سے علحدہ کیا جاسکتا ھے اور نہ ان کا معیار حسن عالم دوشیزگی سے آگے بڑھتا ھے - ان کی حب نسوانیت دوشیزہ پرستی تک محدود ھے اور اس کی وجہ شاید یہ ھے کہ جس طرح ھمارے نظام زندگی میں عورت اپنی مالی ضروریات کے لئے مرد کی دست نگر ھے اسی طرح مرد اپنی شہوانی ترغیبات کے لیے اس کا غلام بن گیا ھے -

زندگی میں حسن و عشق کے لئے بڑی جگہہ ھے اور شراب و شباب کے لیے بھی - لیکن ان کے نام پر زندگی کے مطالبات سے بے پروا ھونے کی کوششیں رجعت پرورانہ اور لائق تعزیر ھیں —

نذرالاسلام

پورے ھندوستانی ادب میں صرف ایک ایسا شاعر ھے جو میکسم گورکی کی کسوتی پر کھرا اترتا ھے - جو انقلاب پرور ' قدامت شکن اور تغیر پسند ھے - جب ادب کا کام صرف یہ رہ گیا ھے کہ انسان کو رلائے یا سلائے اور یا گمراہ کرے تو اُفق بنگال پر ایک ستارے کا طلوع ھوتا ھے جو صراط مستقیم کا نشان ھے - مختصراً نذرالاسلام کا فلسفۂ زندگی یہ ھے کہ زندگی دایم و قایم ھے اور انسان لاشریک لہ اس کا مالک ھے - انسان اور قدرت کی کش مکش کا نام تہذیب ھے اور انسانیت کی ترقی

کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کس حد تک قدرت پر فتح حاصل کرلی ہے - انسان سب سے افضل اور اکمل ہے - دین حق کا مطلب ہے ہر قسم کے ظلم کا سدباب اور اخوت و مساوات کا قیام - قومیت ' سرمایہ داری ' تمیز رنگ و نسل اور تفریق مذاہب کو وہ انسانیت کے لیے سم قاتل سمجھتا ہے - اس کے خیال میں ایک نسل کو دوسری نسل کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے - ہر آنے والی نسل زندگی کی محافظ اور ضامن ہے —

اس لحاظ سے ' نذرالاسلام ' کو روحانیت نوازی اور داخلیت سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں - جب دنیا حیات و ممات کی کش مکش میں ہے تو وہ ایسے وقت میں فلسفۂ قدرت پر غور و خوض کو غیر ضروری اور مضر مانتا ہے - اس وقت فلسفۂ قدور (Philosophy of Values) کی فکر کہیں زیادہ اہم اور مفید ہے - جب رجعت اور انقلاب برسر پیکار ہوں تو ادب فصیل پر بیٹھ کر واقعیت (Realism) کے کیمرے سے فوٹو نہیں لے سکتا - یا تو وہ رجعت کے قلعے میں جا چھپے گا یا انقلاب کے میدان میں ہوگا اور یا تصوف و داخلیت کے خندق میں جا گرے گا - طبیعتاً وہ باغی اور سرکش ہے - حسن و عشق کی وادیوں میں گرفتار ہو کر بھی اپنی منزل کو نہیں بھولتا " پجارن ' میں عشق کی ناکامیوں کا رد عمل یوں بیان کرتا ہے : " معلوم ہوتا ہے کہ اب میں اپنی منزل کو پہچان گیا - کیوں نہ اب میں موت درآغوش طوفان کا ہم سفر بن جاؤں - راستے میں کس کی یاد میں فریاد کرتا پھروں ؟ کیوں نہ آتش فشاں پہاڑ اس مرتبہ اپنے غارتگر دہانے کھول دیں ؟ کیوں نہ میری گرم گفتاری بغاوت کے جھنڈے لہرا دے اور موت کے ترانے میرے ہم سخن بن جائیں - لے آؤ اپنے آتشیں رتھ اور پھونک دو

ھنگام قیامت کے صور! برساؤ زھر و آتش میں بجھے ہوے تیر! برباد کردو اِس دنیاے معصیت کو! ٹپکاؤ یہ خونیں شراب عزرائیل کے گلے میں!"

نذرالاسلام کے نزدیک دنیا ھمیشہ دو طبقوں میں بٹی رھی ھے - اور اس ظالم و مظلوم کی تفریق کو اقبال چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی کی ستیزہ کاری بتاتا ھے - لیکن جہاں ایک "خود گزاری" و "نالۂ نیم شبی" اور 'گنبد نیلوفری' کے تماشوں کا آسرا ڈھونڈتا ھے' دوسرا مظلوموں کو اتحاد و انقلاب کا درس دیتا ھے :

"میں اس روز مطمئن ھونگا جب مظلوموں کی فریاد فضاے آسمانی میں نہ گونجے گی - اور جب میدان جنگ میں تلوار اور خنجر کے خوف ناک ترانے نہ سنائی دیں گے - وہ جو ازلی باغی اور میدان جنگ سے نالاں ھے' صرف اسی روز خاموش ھوگا -" (باغی)

"وہ جو سمندر کی گہرائی میں' آسمان کی وسعت میں' زندگی کے ھیجان میں 'فضا' کی ھر سمت میں موت سے نبرد آزما رھتا ھے — وہ جس نے بادل کی بیٹیوں کو کنیز بنا رکھا ھے کہ جو بجلی کو اپنی مٹھی میں پکڑے رکھتا ھے میں اسی کے آستانے پر سر جھکاتا اور اسی کے گیت گاتا ھوں -"

(پیام شباب)

اپنے عزم راسخ کے لیے وہ کسی معاوضے کی تمنا نہیں کرتا - وہ حال کی ترجمانی کر رھا ھے تاکہ انسانیت کا مستقبل روشن ھو زمانہ اُسے یاد کرے گا یا نہیں اسے اس کی پروا نہیں ھے :

"میں زمانۂ حال کا شاعر ھوں' مستقبل کا پیغمبر نہیں ھوں —

کوئی کہتا ہے کہ اگلے زمانے میں تجھے کون یاد کرے گا۔ کوئی کہتا ہے کہ شاعر کو قید و بند سے کیا نسبت! کسی کا مشورہ ہے کہ تو دوبارہ جیل جا کہ وہیں خوب لکھہ سکتا ہے - مولوی میرے چہرے پر اسلام کی علامت (داڑھی) نہ پاکر مایوسی سے اپنی داڑھی کھجانے لگتا ہے- ہندو کہتے ہیں کہ اس نے ہندو لڑکی سے شادی کر کے اپنی فرقہ پرستی کا ثبوت دیا ہے - گاندھی جی مجھہ پر تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں - عورتیں کہتی ہیں کہ یہ دشمنِ نسواں ہے اور مرد مجھے عورت پرست بتاتے ہیں- غرض کہ میری جان ضیق میں ہے —

لوگو ' سنو کہ یہ دل انتقام اور درد کی آگ سے پھنکا جارہا ہے - تن تنہا خون نہیں بہا سکتا ' اس لیے اپنے خون سے یہ نظمیں لکھہ رہا ہوں -

مجھے اس کی پروا نہیں کہ مستقبل مجھے یاد کرے گا یا نہیں -

تمنا صرف یہ ہے کہ جو لوگ خلق خدا کو بھوکوں تڑپا رہے ہیں میری خونچکاں تحریر ان کے لیے پیام موت ثابت ہو!" سرمایہ اور محنت کے تصادم کے انجام پر سماج کی قسمت کا انحصار ہے - وہ طبقۂ محنت کش ہی ہے جو تقسیم کی بے انصافیوں کو دور کرکے پیداوار کے ذرایع کو انتہاے عروج پر لے جا سکتا ہے - شاعر اس کی فتح یابی کا ترانہ یوں گاتا ہے :

" وہ مبارک ساعت آپہنچی -

ہتھوڑی اور کدالی لیے جو پہاڑوں کو کاٹ کر رکھہ دیتا ہے '

راستے کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں '

تمہاری خدمت کے لیے جس نے قلی اور مزدور کا روپ لیا ہے '

تمہارا بارِ گناہ اٹھانے کے لیے جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے '

وہی — صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے - میں اسی کے گیت گاتا ہوں-

اس کا ٹوٹتا ہوا دل ایک نئی دنیا کی تعمیر کرے گا-

اونچی عمارتوں میں رہ کر اب یہ توقع نہ کرو کہ یہ خاک نشیں ہمیشہ تمہارے آگے سربسجود رہے گا۔

جو لوگ فرط احترام سے مادر گیتی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے ہیں وہ انہیں ہی اپنا وارث بنائے گی -

میں ان پیروں کو بوسہ دیتا ہوں جن سے لپٹ کر مٹی اپنی یگانگی کے اعلان کرتی ہے -

آج بے کسوں اور مظلوموں کے خون سے رنگ کر بطن گیتی سے آفتاب تازہ پیدا ہوا ہے - اب تمام پابندیوں اور بندھنوں کو توڑ کر پھینک دو -

فلک کج رفتار کو چاہیے کہ پاش پاش ہو کر ہمارے آشیانے پر گر پڑے -

ہمارے سروں پر آفتاب و ماہتاب اور ستارے پھول بن کر برسیں کہ ہم نے ایک جہان نو کی داغ بیل ڈالی ہے —

مزدوروں کی جمعیت کو مژدہ ہو کہ ہم سب ایک ہی کارواں کے مسافر ہیں - ایک کا دکھہ سب کے لیے موجب اندوہ ہے اور ایک کی توہین بنی نوع انسان کی توہین ہے —

آج دنیا کے کل بندھن کٹ رہے ہیں اور ایک عظیم الشان دور بیداری کا آغاز ہو رہا ہے جسے دیکھہ کر خدا مسکراتا ہے اور شیطان خوف سے لرزتا ہے!"

نذرالاسلام شباب کا ہمدوش اور انقلاب کا نقیب ہے - وہ تغیر کا حامی اور جمود کا دشمن ہے - وہ قدیم کا حریف اور جدید کا علم بردار ہے - وہ قدرت اور سماج کے مظالم کے خلاف علم جہاد بلند کرتا ہے اور شاعری کو اس مہم میں چھاونی کی کسبی نہیں بلکہ جنگ کی دیوی بنا دیتا ہے - اس کی شاعری ادب ہند کے رستے میں ایک نئی للکار ہے جو بتاتی ہے کہ آرٹ موت کا نہیں زندگی کا پروردہ اور خادم ہے - وہ اس روح کو مٹا

دے گا جو جسم کو قید سمجھتی ہے - وہ استعمار و استبداد کو فنا کر کے حسن و عشق کے صحیح جذبات سے انسان کو آشنا کرے گا —

ادب جدید کی ضرورت

اس مختصر سے سماجی تجزیے میں ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ ادب ہند کا دور قدیم حقائق زندگی سے نا آشنا اور بالکل داخلی تھا - کوئی حل پیش کرنا تو درکنار وہ زندگی کے مسایل کو سمجھتا ہے اور نہ سمجھنا چاہتا ہے - دور جدید زندگی سے اس حد تک بیگانہ نہیں ہے اور اس کی خدمت کا ولولہ بھی رکھتا ہے - لیکن اس کے بتلائے ہوئے راستے بڑی حد تک گمراہ کن ہیں -

ادب کا فرض اولین یہ ہے کہ دنیا سے قوم' وطن' رنگ و نسل اور طبقہ و مذہب کی تفریق کو مٹانے کی تلقین کرے اور اس جماعت کا ترجمان ہو جو اس نصب العین کو پیش نظر رکھ کر عملی اقدام کر رہی ہو - انسانیت کے دشمنوں کی دشمنی دراصل درد انسانی کی دلیل ہے - اب تک ہمارا ادب زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بیچارگی کا نوحہ پڑھتا آیا ہے - اب اسے اس جذبۂ بزدلی سے نکل کر یہ کہنا چاہیے کہ زندگی ابدالاباد تک ہے اور انسان اس کا کارساز حقیقی ہے - قیامت کے معنے یہ ہیں کہ روح الاجتماع داور منتشر بن کر استبداد کو ہمیشہ کے لیے جہنم رسید کرے اور پھر اسی زمین پر ایک ایسے بہشت کی تخلیق کرے جس میں ہر انسان ذہنی جسمانی اور روحانی ترقی کی بلندیوں تک پہنچ سکے - انسانیت اور ادب کے مسلک الگ نہیں ہیں اور دونوں کی نجات کا رستہ بھی ایک ہے - وہ یہ ہے کہ ستم رسیدہ انسانیت اپنے حقوق اور ان کے غاصبوں کو سمجھے اور ان تمام پابندیوں کو توڑ دے جو اس کے ارتقا کی راہ میں حایل ہوں - یہ مضمون اردو کے ادیبوں کے لیے لکھا گیا ہے ' لہذا میرا

خطاب ان سے ہے —

ایک طرف پولیس کا وہ پنشن خوار داروغہ ہے جو تا عمر اپنی فرعونیت اور ہوس پرستی کا مظاہرہ کرنے کے بعد تسبیح کے دانوں پر اپنے گناہوں کا شمار کر رہا ہے - اسے ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جو اسے رلانے اور سلانے میں مدد پہنچائیں - پھر وہ مولوی ہے جو دین کے پردے میں سب سے بڑا دنیا دار ہے اور جس کی ہوس پرستی کو اشعار کے اس ناپاک دفتر سے ایک گونہ تسکین ہوتی ہے - اور وہ تعلیم زدہ لڑکیاں ہیں جو زن مرید شاعروں کی ٹھنڈی سانسیں سن کر کسی مجنوں کے انتظار میں بیٹھی ہیں - وہ ایسی کہانیاں پڑھنا چاہتی ہیں جن کی ہیروئن وہ خود ہوں اور جن کے ہیرو خود کشی کر کے بٹیروں کی طرح تڑپ رہے ہوں -

آپ اب تک انہیں لوگوں کے لیے لکھتے رہے ہیں - کیا آپ کی آئندہ ادبی کاوشیں بھی انہیں کے لیے وقف ہوں گی؟ —

دوسری طرف وہ کسان ہے جو سماج کی عمارت کا سنگ بنیاد ہے - زمین دار اور سود خوار جونک کی طرح اس کا خون پی رہے ہیں - مولوی اس پر خود گزاری اور صبر و شکر کا جادو پھونکتے ہیں - اس کی بیوی روٹیوں کے لیے عشوہ فروشی پر مجبور ہے - اس کے بچے بھوک سے تنگ آکر آپ کی جیب پر گھات لگائے ہوئے ہیں - اور وہ مزدور ہے جو سماج کی عمارت کا ستون ہے - وہ مال اس لیے پیدا کرتا ہے کہ منافع کے نام سے ایک دوسرا شخص اسے ہتیا لے جس کے لیے لغت میں 'مالک' کا لفظ تراشا گیا ہے - قید خانے کی کوٹھڑیوں سے بد تر جھونپڑیوں میں ' پلیگ اور ہیضے میں تڑپ کر وہ بھوکا اور ننگا مزدور اس حسرت میں مر جاتا ہے کہ مارواڑی کا بیانڈ یا کسی امیر کا کتا کیوں نہ ہوا! —

کیا اس کے حال زار نے کبھی آپ کے دل میں چٹکی لی ہے؟ کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا کبھی ان اسباب و عِلل کو مٹانے کا خیال آپ کے ذہن میں آیا ہے؟ - اگر نہیں تو آپ ادب کے لیے باعث ننگ ہیں - ایسے ادیبوں کے لیے کروپاتکن کہتا ہے: " کیا تم مصنف بننے کی آرزو رکھتے ہو؟ تو اپنے ملک کے مصائب کی داستان پر نظر ڈالو اور اگر اس کے بعد تمہارا دل خون نہیں ہوجاتا تو اپنے قلم کو پھینک دو - اس قلم کا مصرف صرف یہ ہے کہ تمہارے بےحس دل کی ناپاکی کا پردہ فاش کرتا رہے؟ "

گویا ادب آج کبیر داس کی زبان میں کہہ رہا ہے:

' کبیرا ' کھڑا بزار میں لیے لکاٹھی ہاتھ جو گھر پھونکے آپنا چلے ہمارے ساتھ -

ہمیں ان لوگوں سے غرض نہیں جن کے دماغ روپیوں کے لیے چکلا گھر بنے ہوئے ہیں اور جو سرمایہ دار پبلشروں اور جاہل و بے درد شہریوں کے زر خرید غلام ہیں - ہمارا خطاب ان سے ہے جو تخلیق ادب کو رتبۂ پیغمبری دیتے ہیں - جو حق گو اور حق پوست ہیں اور جو سچ کہتے ہوے کسی قسم کی پابندی سے نہیں ڈرتے -

اردو اور مذہب دو مختلف چیزیں ہیں - اردو اگر قومی زبان بننا چاہتی ہے تو اسے ہر قسم کے خیالات و جذبات کا حامل بننا چاہیے - وہ زبان ہرگز کسی ترقی یافتہ قوم کی زبان بننے کا استحقاق نہیں رکھتی جس کے حسن و قبح کا فیصلہ کوئی مذہبی جماعت کرتی ہو - یعنی اردو کے ادیبوں کو رواداری اور روشن خیالی کی تلقین کرنا چاہیے -

متوسط طبقے کی زندگی بند پانی کی موری ہے - عوام کو سمجھنے کی کوشش کیجیے اور انہیں بتایئے کہ وہ اس خستہ حالی میں کیوں ہیں اور

کس طرح نجات حاصل کر سکتے ہیں —

اردو ادب کی زن پرستی دونوں جنسوں کے لیے باعث عار ہے - پردے کی سختی اور عورت کی کم یابی نے مرد کے نقطۂ نگاہ کو یکسر Masochistic (خود اذیتی) بنا دیا ہے - سجاد حسین اور مہدی حسن جیسے آزاد خیال ادیب بھی عورت کو شہوت رانی کا آلہ سمجھتے ہیں - جنسی مساوات کی تبلیغ ہی اس ناپاک ذہنیت کو دور کر سکتی ہے —

مولویوں اور پنڈتوں کی زبان میں گفتگو بند کیجیے - عربی و سنسکرت کو ان کے لیے اور انہیں عربی و سنسکرت کے لیے چھوڑ دیجیے - ادب کو فطری بنانے کے لیے ہندوستانی اسپرٹ ہی نہیں ہندوستانی صورت اور اسلوب بھی اختیار کیجیے —

ادب جدید کے حامیوں کی انجمن بنائیے اور اس کے آرگن شایع کیجیے تاکہ جدید خیالات کی اشاعت میں آسانی ہو اور قدامت پرستوں کے اعتراضات کا جواب دیا جا سکے —

ہر سیاسی اور سماجی انقلاب کے پہلے ایک ذہنی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر ہندوستانی عوام ہر اعتبار سے ملکی جد و جہد سے الگ اور نا آشنا ہیں تو اس کی ذمہ واری ان کے تعلیم یافتہ طبقے پر ہے جو خود بھی اوہام و تعصب کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے - اب وہ وقت آگیا ہے کہ اردو کے ادیب بھی اپنے بنگالی اور ہندی معاصرین کے نقش قدم پر چلیں اور یہ ثابت کر دکھائیں کہ ادیب کا مشرب قومی و مذہبی تعصبات سے پاک ہے اور وہ واقعتاً انسانیت کا خادم، مصور اور پیشوا ہے —

سوچیئے کہ انسانیت کے ماضی میں آپ کے لیے کون سے اشارات پنہاں ہیں، مسایل حال کیا ہیں اور مستقبل کی راہ کیا ہے - اپنے انداز بیان

کو ایسی جلا دیجیے کہ وہ ظلم کے لیے تلوار اور مظلوموں کے لیے بیداری کا صُور بن جائے —

اور آپ کا مذہب کیا ہو؟ ٹیگور سے بھی کسی نے یہ سوال کیا تھا اور اس کا جواب دنیائے ادب کا جواب ہے!۔ ''میرا مذہب وہ ہے جو ہر آرٹسٹ کا مذہب ہونا چاہیے - میں کسی ایک قوم یا مذہب یا ملک کا ترجمان نہیں ہوں - میری زندگی بنی نوع انسان اور جملہ اقوام کے لیے اور میرا پیغام ان کے ارتقا کے لیے ہے - میری روح زندگی اور انسانیت کی وحدت میں گم ہوگئی ہے اور میں مذہبی، قومی و طبقاتی پابندیوں کو توڑ چکا ہوں'' —

اور آپ کا فرض کیا ہے؟ جو ہر انسان کا فرض ہونا چاہیے - کروپاٹکن کے آگے بھی یہی سوال آیا تھا اور اس کا جواب ہر ایمان دار ادیب کا جواب ہے : ''اگر تمہیں اپنے دل و دماغ میں جوانی کی امنگوں کا احساس ہوتا ہے، اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو، اگر تم پاک و صاف، مکمل اور ارتقا پرور زندگی سے سرفراز ہونا چاہتے ہو — یعنی اگر تم ان حقیقی مسرتوں سے محظوظ ہونا چاہتے ہو جن کی تمنا ہر ذی حیات کرتا ہے — تو مضبوط بنو، عظمت و وقار کے زینوں پر چڑھو اور ہر کام مستقل مزاجی سے انجام دو —

اپنے چاروں طرف زندگی کی تخم ریزی کرو - خبردار! اگر تم دھوکا دوگے، جھوٹ بولوگے، اور سازش کروگے تو آپ اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاؤگے، قعرِ پستی میں جاگروگے اور تمہاری حالت اس غلام کی سی ہو جائے گی جو اپنے آقا کو اپنا خدا ماننے لگتا ہے! اگر تمہارا رجحانِ طبع اسی طرف ہو تو یہی کرو لیکن اس حالت میں لوگ تمہیں کم زور، حقیر اور قابل نفرت سمجھنے لگیں گے اور تم سے ایسا ہی برتاؤ کریں گے - تمہاری طاقت کا کوئی ثبوت نہ پا کر عوام تمہیں قابل رحم سمجھیں گے — سوچو

رحم و کرم کے قابل ہو جانا انتہائی ذلت ہے - اگر خود اپنی صلاحیت کے بال و پر نوچتے ہو تو دنیا کو دشنام نہ دو - اس کے خلاف خود کو کمر بستہ کرو اور اگر کہیں تمہیں کوئی بے انصافی نظر آتی ہو خواہ اس کی نوعیت کسی قسم کی بھی کیوں نہ ہو — تو تم اس جبر و ظلم اور ناحق کے خلاف بغاوت کردو - جہاد کرو تاکہ ساری دنیا اطمینان کی زندگی بسر کرسکے - یقین جانو کہ اس لڑائی میں تمہیں جو روحانی مسرت حاصل ہوگی وہ اور کہیں نہیں مل سکتی — "

ٹیگور کے ادبی مضامین

تاریخی ناول

(مترجمہ پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا النکار)

انسانی معاشرے کا وہ بچپن کہاں گیا جب قدرتی واقعات اور مصنوعی انسانی خیالات بھائی بہنوں کی طرح ایک خاندان میں ایک ساتھ کھیلتے ہوئے بڑے ہوئے تھے - یہ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ان واقعات و خیالات میں علٰحدگی کی ایک بڑی خلیج حائل ہو جائے گی —

کسی زمانے میں رامائن اور مہابھارت تاریخ کی حیثیت رکھتی تھیں لیکن موجودہ تاریخ انہیں اپنے زمرے میں شامل کرنے میں بہت پس و پیش کرتی ہے - وہ کہتی ہے کہ شاعری کے ساتھ تاریخ کا بیاہ ہوجانے سے اس کا بلنس مٹ گیا ہے - اب اس کے خاندان کو دوبارہ اُبھارنا اتنا مشکل ہو گیا ہے کہ تاریخ شاعری ہی کی شکل میں اپنا تعارف کرانا چاہتی ہے - شاعری کہتی ہے "بہن تاریخ! تمہارے اندر بھی بہت کچھ جھوٹ بھرا ہے اور مجھ میں بھی بہت سی سچائیاں ہیں اس لیے ہم دونوں پہلے کی طرح میل ملاپ کرلیں -" تاریخ کہتی ہے "نہیں بہن' اپنے اپنے حصے تقسیم کرلینا ہی اچھا ہے -" علم کے امین * نے ہر جگہ یہ تقسیمی

---

* زمین کے حدود کے متعلق جھگڑوں اور دیوانی مقدمات کا فیصلہ کرنے والے سرکاری عہدہ داروں کو کہتے ہیں —

کام شروع کردیا ہے - حقیقت اور تخیل کی سلطنتوں میں حد بندی کے خطوط کھینچنے پر اس نے کمر باندہ لی ہے —

تاریخ کی حد عبور کرنے کے جرم میں تاریخی ناولوں کے خلاف جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان سے ادبیات کا شیرازہ منتشر ہو رہا ہے —

اس قسم کا اعتراض صرف ہمارے ہی ملک میں نہیں کیا گیا ہے ' صرف نوین بابو * اور بنکم بابو ہی مجرم نہیں ٹھیرائے گئے ہیں ' بلکہ تاریخی ناول نویسوں کا پیشوا اور امام اسکاٹ بھی اس سے چھٹکارا نہ پاسکا —

موجودہ انگریز مورخین میں فری مین صاحب کا نام بہت مشہور ہے - ناولوں میں تاریخ کی جو مٹی پلید ہوتی ہے اس پر انہوں نے ناراضگی کا اظہار کیا ہے - وہ کہتے ہیں کہ صلیبی جنگوں کے بارے میں جو لوگ کچھہ بھی جاننا چاہتے ہیں انہیں اسکاٹ کا آئون ہو (Ivon hoe.) نہیں پڑھنا چاہیے —

بے شک ہمیں یورپ کی صلیبی جنگوں کے بارے میں حقیقت واقعی کا علم حاصل کرنا چاہیے لیکن اسکاٹ کے آئون ہو میں ابدی انسانی معاشرے کی دوامی سچائی کا عکس دیکھنا بھی ہمارے لیے ضروری ہے - صرف یہی نہیں لیکن اس کے جاننے کی خواہش اتنی زبردست ہوتی ہے کہ یہ جانتے ہوے بھی کہ صلیبی جنگوں کے متعلق اس میں بہت سی غلطیاں ہیں ' طلبہ ' پروفیسر فری مین سے چھپا کر آئون ہو کے پڑھنے کی ترغیب کو نہیں روک سکتے —

اب قابل غور سوال یہ ہے کہ کیا سر والٹر اسکاٹ تاریخی واقعات اور ادبیات کی حقیقت دونوں کا لحاظ رکھہ کر آئون ہو کو نہیں لکھہ سکتے تھے ؟ -

وہ لکھہ سکتے تھے یا نہیں اس کے متعلق قطعی طور پر کچھہ کہنا تو

* بابو بنکم چندر بنگالی زبان کے مشہور ناول نویس اور بابو نوین چندر تاریخی نظم نگار ہیں -

مشکل ہے لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں تاریخ اور ادبیات کا لحاظ نہیں رکھا —

یہ ممکن تھا کہ انہوں نے جان بوجھہ کر ایسا نہ کیا ہو ' لیکن واقعہ یہ نہیں ہے - پروفیسر فری مین صلیبی جنگوں کے متعلق جس قدر جانتا تھا اسکاٹ اتنا نہیں جانتا تھا - اسکاٹ کے زمانے میں واقعات کی تشریح اور تاریخی حقیقتوں پر غور و خوض کرنے کا طریقہ اس قدر ترقی پر نہیں تھا —

مخالفین کہیں گے جب اسکاٹ لکھنے کے لیے بیٹھا تھا تو لازم تھا کہ اچھی طرح سوچ سمجھہ کر لکھتا لیکن تحقیق کا یہ سلسلہ کب ختم ہوگا ' ہم قطعی طور پر یہ کب جان سکیں گے کہ صلیبی جنگوں کے متعلق تمام معلومات حاصل ہوچکی ہیں ' ہم یہ کس طرح جان سکیں گے کہ آج جسے ہم تاریخ کی اٹل سچائی کہہ رہے ہیں کل نئے دلائل اس کے سر سے حقیقت کا تاج نہیں اتار لینگے ؟ جو لوگ موجودہ مروجہ تاریخ کا سہارا لے کر تاریخی ناول لکھیں گے کل کے نئے مورخین اگر ان ناولوں کی بے قدری کریں تو ہم اس کا کیا جواب دیں گے ؟

مخالفین کہیں گے کہ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جتنا جی چاہے ناول لکھو لیکن تاریخی ناول مت لکھو - اگرچہ یہ خیال ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوا ہے لیکن انگریزی ادب میں اس کی بازگشت سنائی دے رہی ہے - سر فرانسس پالگریو کہتے ہیں کہ تاریخی ناول ایک طرف تاریخ کا تو دوسرے طرف کہانی کا بھی بڑا دشمن ہے - مطلب یہ ہے کہ ناول نویس کہانی کی خاطر تاریخ پر حملہ کرتے ہیں اور پراگندہ تاریخ کہانی کو خراب کر دیتی ہے - اس طرح کہانی کا سسرال اور میکا دونوں نیست و نابود ہوجاتے ہیں —

اس قسم کے اعتراض کے باجود تاریخی شاعری اور ناول ادبیات میں کیوں

جگہ حاصل کرتے ہیں اس مضمون میں ہم اس کے اسباب کی وضاحت کریں گے۔

سنسکرت کی ادبی کتابوں میں شاعری ایک رس بھرے جملے کو قرار دیا گیا ہے۔ شاعری کے متعلق اس سے زیادہ مختصر اور وسیع المعنی تعریف ہم نے کہیں نہیں دیکھی۔ بے شک رس کی تعریف کو سمجھانے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ جس شخص میں رس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ہے اس کے لیے رس کی تعریف بے معنی چیز ہے اور جس میں نہیں ہے اسے ان باتوں کے جاننے کی ضرورت ہی نہیں —

سنسکرت کی ادبیات میں اصلی رسوں کی نو قسمیں * بیان کی گئی ہیں۔ لیکن بہت سے ناقابل بیان اور ملے ہوئے (مرکب) رس بھی ہیں جنھیں بیان کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی —

انھیں متروک رسوں میں سے ایک کا نام "تاریخی رس" رکھا جا سکتا ہے اور یہ رزمیہ رس شاعری کی جان ہوتا ہے —

کسی خاص شخص کا دکھ سکھ اس کی ذات کے لیے ہی کیا کم ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے واقعات اس کے سامنے سایے کی طرح نظر آتے ہیں۔ اگر اس طرح کسی خاص شخص یا اشخاص کی زندگی کے واقعات کے مدو جزر، عمل اور رد عمل ناول میں بیان کیے جائیں تو رس درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے اور رس کا یہ جوش ہمارے دل پر گہری چوٹ کرتا ہے۔ ہم میں سے بہتوں کے رنج و راحت کا دائرہ محدود ہے۔ ہمارے جذبات

---

* نو قسمیں یہ ہیں۔ (۱) شرنگار یعنی عشقیہ۔ (۲) ہاسیہ یعنی مضحک۔ (۳) کرون احساس غم پیدا کرنے والا۔ (۴) ویر یعنی رزمیہ۔ (۵) رودر یعنی غصہ پیدا کرنے والا۔ (۶) بھیانک یعنی ڈراونا۔ (۷) بی بھتس یعنی نفرت انگیز۔ (۸) ات بھت حیرت انگیز۔ (۹) شانت جس میں سکون ہو۔

کی گرمی چند رشتہ داروں اور احباب تک پہنچ کر ختم ہوجاتی ہے - وش ورکش * میں نگیندر' سوریہ مکھی اور کند نندنی کے عیش و کلفت اور رنج و راحت کو ہم اپنا ہی سمجھ سکتے ہیں کیونکہ ان تمام تکلیفوں اور راحتوں کا مرکز نگیندر کا خاندان ہے - نگیندر کو اپنا پڑوسی تصور کرنے میں ہمیں کوی دقت نہیں ہوتی -

لیکن دنیا میں بہت کم لوگ اس بام رفعت تک پہنچتے ہیں دکھہ سکھہ دنیا کے بڑے بڑے واقعات کے ساتھہ وابستہ ہوجائیں - حکومتوں کا عروج و زوال' زمانے کے آئندہ واقعات کا سلسلہ' ان کی روز مرہ کی زندگی ہی کے کارنامے ہیں - ان کی کہانی جب گیت بن جاتی ہے تو رباب عالم اس کے سر کم ٹھیک کرتا ہے اور بجانے والے کی انگلیاں ہر تار میں ایک عجیب' پرسکون اور بہت دور تک پھیلنے والی مسلسل جھنکار کو بیدار کردیتی ہیں —

انسان کے ساتھہ زمانے کی یہ رفتار ہمیں روزانہ دکھائی نہیں دیتی قوم کی تاریخ' کو بدلنے والا اس قسم کا کوئی بڑا آدمی اگر ہمارے سامنے موجود ہو تو بھی موجودہ مختصر زمانے میں وہ اور اس کے کارنامے دونوں اکٹھے نظر نہیں آسکتے - اس لیے اس قسم کے لوگوں کو ہم انہیں کے زمانے میں ٹھیک طور پر نہیں دیکھہ سکتے - انہیں اگر ہم ایک خاص شخص کی شکل میں نہیں بلکہ زمانے کے ایک جز کی شکل میں دیکھنا چاہیں تو ہمیں ان سے دور کھڑا ہونا پڑتا ہے' انہیں ماضی کے پس منظر میں رکھنا پڑتا ہے' وہ جس عظیم الشان اسٹیج کے ہیرو تھے انہیں اور اس اسٹیج کو ملا کر دیکھنا پڑتا ہے —

---

* مشہور بنگالی مصنف بنکم چندر چٹرجی کا ناول ہے —

ہمارا روزانہ کے دکھہ سکھہ سے دور ہوجانا یعنی جب ہم نوکری کرکے، روکا کر، کھا پی کر وقت گزار رہے ہوں اس وقت دنیا کے شارع عام پر جو بڑے بڑے رتھہ بان دنیا کے رتھہ کو چلاتے ہوے جا رہے ہیں، چند لمحوں کے لیے ان کا خیال کرکے زندگی کے اس تنگ دائرے سے باہر نکل آنا، یہی حقیقی طور پر تاریخ سے لطف اندوز ہونا ہے —

ایسا نہیں ہے کہ اس طرح کے قصے کامل طور پر تخیئلی نہیں ہوسکتے لیکن جو قصے قدرتاً ہم سے دور ہیں جو ہمارے علم سے بالا تر ہیں، انہیں کسی بہانے سے اگر ہم حقیقی واقعات کے ساتھہ ملادیں تو مصنفوں کے لیے، پڑھنے والوں کے دل میں اعتماد پیدا کرنا آسان ہوجاتا ہے - رس کی تخلیق ہی مقصد ہے - لہذا رس پیدا کرنے کے لیے تاریخی ذرائع کی جس قدر ضرورت ہوتی ہے شاعر ان سے کام لینے میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں کرتے —

شیکسپیر کے انتنی اور کلیو پتیرا ڈراما کا جو مرکزی نقطہ ہے وہ دنیا کے لیے ایک آزمودہ اور روز مرہ کی جانی بوجھی حقیقت ہے - بہت سے غیر معروف، گمنام اور قابل اشخاص نے عورتوں کے مزہ لینے والے جال میں پھنس کر دین و دنیا خراب کرلی ہے اور اس طرح کی چھوٹی چیزوں کے اہم بن جانے سے جو تباہ کن نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کے حسرت ناک مناظر سے تاریخ بھری پڑی ہے —

ہمارے روز مرہ کے دیکھے بھالے مرد اور عورت کی محبت کے زہر اور امرت بھرے کار ناموں کو شاعر نے ایک عظیم الشان تاریخی اسٹیج پر لاکر نہایت وسیع اور شاندار بنا دیا ہے - ذہن کے انقلاب کے بعد مسلک کا انقلاب شروع ہوتا ہے - محبت کی کش مکش کے ساتھہ روم کے تمام لوگوں

میں پھوٹ ڈالنے والی زبردست جنگ کی تیاری ہوتی ہے - ایک طرف کیلو پیٹرا کے نشاط خانے میں غزل خوانی ہو رہی ہے اور دوسری طرف سمندر کے کنارے طبل جنگ گونج رہا ہے - شاعر نے محبت اور احساس غم کے رس کے ساتھ تاریخ کا رس ملادیا ہے - اس لیے اس ڈرامے میں دل کو ایک حیرت انگیز وسعت مل گئی ہے —

مورخ ممسن اگر شکسپیر کے اس ڈرامے کو عالمانہ حوالوں کی روشنی میں دیکھے تو اس میں سہو زمانی (Anachronism) اور تاریخ کی بہت سی غلطیاں نظر آسکتی ہیں - لیکن شیکسپیر نے پڑھنے والوں کے دلوں پر جو جادو کردیا ہے ' غلط اور بگڑی ہوی تاریخ کے ذریعے جس تاریخی رس کی تخلیق کی ہے وہ جدید تاریخی تحقیقات کے باوجود بھی مٹ نہیں سکتا -

اسی لیے ہم نے اس سے پہلے کسی تنقیدی مضمون میں لکھا تھا کہ " ناول میں تاریخ کے مل جانے سے ایک خاص رس پیدا ہوجاتا ہے - ناول نویس صرف اسی تاریخی رس کے حریص ہوتے ہیں - تاریخی حقیقت کی انہیں کوئی خاص پروا نہیں ہوتی - اگر کوئی شخص ناول میں تاریخی رنگ و بو سے مطمئن نہ ہو اور اس میں سے پورے تاریخی اجزا کو نکالنے لگے تو یہ گویا سالن میں زیرہ ' ہلدی ' دھنیا اور سرسوں کی تلاش کے مصداق ہے - مسالے کو ملا کر جو لوگ سالن کو لذیذ بنا سکتے ہیں وہ بنائیں اور جو اسے پیس کر سالن میں ڈالتے ہیں ان سے بھی ہمیں بحث نہیں کیونکہ یہاں صرف مزے سے غرض ہے مسالا تو اس کا ایک ذریعہ ہے - یعنی ناول نویس اگر تاریخ کو جوں کا توں رکھ کر ناول لکھیں یا اس کے اجزا ملا کر تاریخی رس پیدا کرسکیں تو انہیں اپنے مقصد میں کامیاب سمجھنا چاہیے -

اس لیے اگر کوئی رام چندر کو ادنیٰ اور راون کو اعلیٰ حیثیت

میں پیش کرے تو کیا کوئی جرم نہ ہوگا؟ ضرور ہوگا - لیکن وہ جرم بلحاظ تاریخ نہیں بلکہ بلحاظ شاعری ہوگا - مقبول عام حقیقت کو ایک دم پلٹ دینے سے رس کا مزا جاتا رہتا ہے - گویا مطالعہ کرنے والوں کے سر پر ضرب سی لگتی ہے اور اس سے شاعری چست ہوکر گر پڑتی ہے —

یہی نہیں! اگر کسی جھوٹی بات کو بھی مدت سے عام لوگ سچ مانتے چلے آرہے ہوں اور اگر تاریخ اور سچائی کے لیے شاعری اس کے خلاف احتجاج کرے تو یہ شاعری کا جرم ہوگا - تصور کیجیے کہ اگر آج بغیر کسی شبہ کے یہ ثابت ہوجاے کہ شرابی اور بے اصول یادؤں کا خاندن یونانی قوم میں سے تھا اور سری کرشن بنوں میں آزادی سے گھومنے والا اور بانسری بجانے والا یونانی قوم کا ایک گوالا تھا' اگر یہ ثابت ہوجاے کہ اس کا رنگ اس کے بڑے بھائی بلدیو کے رنگ کی طرح گورا تھا' اگر یہ ثابت ہوجاے کہ جلا وطن ارجن ایشیاے کوچک کی کسی یونانی حکومت سے یونانی شہزادی سوبھدرا کو جیت لایا تھا اور دوارکا سمندر کے کنارے ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا' اگر یہ ثابت ہوجاے کہ جلا وطنی کے وقت پانڈووں نے فن جنگ کے ماہر عالی دماغ یونانی بہادر کرشن کی مدد سے اپنی حکومت دوبارہ حاصل کرلی تھی اور اس کی باکمال غیر قومی سیاست' جنگی مہارت اور ایسے مذہب کا علم جس میں عمل کی بڑی اہمیت تھی اِن خصوصیات سے حیران ہوکر ہندوستان نے اسے اوتار مان لیا تھا' تو بھی وید ویاس کی مہابھارت نہیں مٹ سکتی اور کوئی نیا شاعر جرأت کرکے کالے کو گورا نہیں بنا سکتا —

ہم نے یہ باتیں سرسری طور پر کہی ہیں - نوین بابو اور بنکم بابو اپنی شاعری کی کتابوں اور ناولوں میں مروجہ تاریخ کے خلاف اتنی دور

جا پڑے ہیں یا نہیں جس سے شاعری کا رس جاتا رہا ہے ' اس کا اندازہ ان کے گرنتھوں کی خاص تنقید کے وقت ہی کیا جا سکتا ہے —

اس حالت میں ہمارا کیا فرض ہے ؟ ہمیں تاریخ پڑھنی چاہیے یا آٹون ہو؟ اس کا جواب بہت آسان ہے - دونوں پڑھنے چاہئیں - حقیقت کے لیے تاریخ پڑھنی چاہیے اور لطف کے لیے آٹون ہو - کہیں ہم غلطیوں ہی کا علم نہ حاصل کرلیں ' اس خدشہ سے جو شخص شاعری کا لطف نہ اٹھاے گا اس میں شئے لطیف کی کمی آجاے گی —

شاعری میں جو تاریخی غلطیاں ہمیں نظر آئیں گی ہم انہیں تاریخ میں درست کرلیں گے لیکن جو شخص صرف شاعری کی کتاب پڑھے گا اور تاریخ پڑھنے کا موقع نہ پاے گا وہ بد نصیب ہے اور جو شخص صرف تاریخ ہی پڑھے گا اور 'سے شاعری کے مطالعے کا موقع نہ ملے گا غالباً یہ شخص پہلے سے بھی زیادہ بد نصیب ہے —

سخنوران ایران در عصر حاضر

از

(از جناب آغا محمد تقی "پارسا" شیرازی پروفیسر اورنگ آباد کالج)

جنبش ادیبانه و مسافرت دانشمندانۀ جناب آقا ... محمد اسحاق

نوید زندگی بخشی میدهد و آیندۀ بسیار درخشانی را بما نزدیک میکند - کم کم ذوق و شوقِ علمی و تشنگی و اشتهائی صادق در مشرق پیدا می شود - آهسته آهسته حاسۀ دانش پژوهی و چشم بصیرتِ مشرقیان بیدار گشته رفته رفته احساس حقیقت جوئی و عاطفۀ تحقیق طلبی آنان را تکان داده بجنبش انداخته است از بی راهۀ تقلیدِ بیرون آمده بشاهراهِ تحقیق افتاده اند - این بهترین نشانِ درخشان و علامتِ نمایان بیداری مشرقیان است -

رازِ ترقی اروپا

ترقی اروپا از یک نقطۀ بسیار مهمی آغاز گشته و رفته رفته بزرگ گردیده و بالاخره به تمام شئونِ زندگی محیط شده است —

اروپا رهین منت آن اشخاص با همت و حوصله مند است که با پائمیردیِ زحمت درشاهراهِ تحقیق و انکشاف افتاده اند و پافشاری نموده هر چیز را درجا و محلِ آن تحقیق و انکشات کرده اند ' کیمیا و طبیعیات را در عالم تجزیه و مشاهده و تجربه ' جغرافیاے بحری را در دریا و بری را

در کوه و صحرا ، زبان بیگانگان را در وطنِ آنان و همچنین هر چیز را از راه خودِ آن و درجا و مرکزش تحصیل و تحقیق کرده اند - سپس باهوش کافی و موشکافی آن راه مرتب ساخته اشاعت داده اند و در نمایش گاه عالم عملی گزارده اند —

پایهٔ بلند ایران شناس بزرگ و معروف استاد ادورد براون مرحوم (Edward Brown) نیاز مند معرفی نمی باشد - این استاد بزرگوار برای تحقیقات ادبیات زبان فارسی از انگلستان رهسپار ایران گردیده - کوه و بیابان را در نوردیده رو بمرکز نموده داخل محیط ادبیات زنده شده است - جلیس ادباء انیس شعرا ، همنشین خاص و عام گشته - وضع مملکت را مطالعه کرده - با روح ادبی ، احساسات شعری ، عواطف ملی ، آداب و اخلاق و نفسیات ایرانیان آشنا شده - نه تنها ایران شناس شده بلکه متخلق به آداب ایرانیان گشته ، محفل آرا ، مهمان نواز ، ایران پرست گردیده - پس قدم در جادهٔ ادب گذاشته و قلم تحقیق را بحرکت آورده است - همیشه و هرجا از خامه وزبان او روح ، عواطف ، احساسات ایرانی تراوش میکند و با این حال تاریخ ادبیات ایران نوشته است - این است رفتار یک محقق اروپائی که از راه دور و دراز باوجود بیگانگی ادبی و اخلاقی و زبانی رو بایران میکند —

حال می رویم بر سر مطلب - اردو زبان ، مشرقی ، همسایهٔ ایران ، که یگانگیِ ادبی ، اخلاقی با فارسی زبانان دارد ، و روح ادبیات هردو یکی است ، باید برای تحقیقات ادبیات فارسی توجه مرکز کرده خود داخل محیط ادبیات زنده شود ، و خود برای تحقیق ادبیات شاهراه نزدیکی کشف کند ، نه که مانند مقلدین گمراه شده راه دور و دراز پیش گرفته

خود را گول زده و دیگران را هم فریب دهند -

بنابرین مسافرت جناب محمد اسحاق و تالیف کتاب "سخن وران عصر حاضر" آیندۂ درخشانی را بما نزدیک میکند —

سرپرستیِ هندوستان از فارسی گزشتۂ درخشانی را تربیت و پرورش داده است - آقا سعید نفیسی تاریخ و تذکرۂ ادباء و شعراء فارسی زبانان هند را تالیف کرده اند و بسیار پسندیده است - سلسلۂ ادبیِ هندوستان و ایران گسیخته شد و مسئولیت هندوستان دو چند شد (انگریزی' اردو) مگر تعلقات اردو و فارسی بحال خود باقی ماند ' و هندوستان مستقیم و غیر مستقیم باز از فارسی سرپرستی کرده دست از نوازشهایِ ادبی نکشید - باز در همین قرن جدائی دست و زبان ادب پژوهان هندوستان ادب و زبان فارسی را در هند زنده نگاه داشته است - و فقط تاریخ همین قرن دربارۂ ادبیات و زبان فارسی در هندوستان محتاج نگارشِ رسالۂ جداگانه است - و این جا فقط به سه خدمت بزرگ اشاره می شود —

(۱) شعرالعجم - از علامۂ بزرگ مرحوم شبلی نعمانی این اعجوبۂ دهر در شعر عجم شناسی یکتا و بے مانند است در پنج جلد تاریخ ادبیات شعریِ فارسی تصنیف نموده و با کمالِ استادی و نکته سنجی تاریخ روحی و شعریِ شعراء را توضیح و تشریح نموده و عظمت روح شعریِ فردوسی و سعدی و حافظ را در نمائش گاه عالمِ ادبیات بے پرده کرده است و به روانِ قدما و متوسطین و متاخرین تروتازگیِ بے اندازه بخشیده است —

(۲) جناب دکتر اقبال که با زبان فارسی مقاصدِ حکیمانۂ خود را سروده اند و در عالم ادبیات یک فلسفۂ جدیدی اضافه نموده اند - چون ایشان

در فلسفۂ مغرب نیز اُستادند و با ذوق شعریِ اروپائی آشنا فوق‌العادہ اشعار ایشان تجدد معنوی و فکری دارد، و زبان فارسی را آئینۂ تفکرات جدید خود قرار دادہ اند، افکار ابکار ایشان کہ در زبان فارسی سرودہ اند شہر تش بارو پاہم رسیدہ و از زبان فارسی بزبان خارجہ ترجمہ شدہ است -

(۳) "سخن وران عصر حاضر" است کہ موضوع این تبصرہ است

قدر و قیمت سخن وران عصر حاضر

تعلقات اردو بہ فارسی

فارسی با شاہنشاہیِ مسلمانان بہ ہند درآمدہ باہم فرماں فرمائی می کردند - سرانجام سلطنت مسلمانان روبزوال نہادہ فارسی پائداری کردہ بہ شکل و قالب دیگر درآمدہ و نام نوی بخود گرفت - یعنی روح فارسی با تمام معنی (ترکیبات، تشبیہات، استعارات وغیرہا) در قالب تازہ حلول کردہ باسم اردو باز دست از فرمان فرمائی نکشید - امروزہ میتوان گفت در ہندوستان، ہیچ زبانے مانند اردو عمومیت ندارد و شمارۂ اردو دانان (ہنود و مسلمانان و اروپائیان) از تمام زبانہاے بومی و بیگانہ بیشتراست از کابل گرفتہ تا مندلہ (Mandalay) زبان اردو آلت تبادلۂ خیالات اقوام گوناگون است - بلکہ بہ ساحلہاے دور دست نیز دست اندازی کردہ است در بیرون ہند زبان این مملکت را ہمین زبان اردو میدانند و بس - از زبان ہندی و ہندوستانی تنہا اردو میخواہند در جا ہاےکہ براے کار و بار تدریس زبان این مملکت میدہند ہمان اردو است - کسی بخواہد یا نخواہد، بداند یا نداند، کشور پہن و دراز ہند میدان و جولا نگاہ اردو است - و آن زبان بومی کہ ادعاے مقابلگی با اردو می کند دائرۂ مختصر تنگی دارد - اردو یک زبان عجیبی است شاید نظیر نہ داشتہ باشد - مدارج ارتقاء خود را

در کمترین وقت طے کرده، و خزانهٔ ادبیات خودرا مخصوصاً نظم، زود معمور و آباد نموده است - نثر و زبان علمی نیز بسرعت شگفت انگریزی دارد خود را بسر منزل خویش نزدیک می کند - اگرچه اردو هندی الوطن است و شمائل آن شباهت ظاهرئی تامی بزبان هندی دارد مگر روح آن و حرکات و سکنات از فارسی است، وروح فارسی باتمام معنی و جمیع خصوصیات درآن حلول کرده است - اگر اردو بخواهد قطع بستگی خود از فارسی بنماید اولاً خزانهٔ ادبیات خود را بدست خویش آتش میزند ثانیاً باید بطور قهقری برگشته در عالم نشو ونمائی طفولیت در آید واین خلاف قانون فطرت است - به فرض محال در آں حال نه ادبیات نه نظم و نه لغت می ماند و اردو مفلس محض می شود - سخن کوتاه از اردو تنها یک نام باقی می ماند - نام هم (اردو) از بیرون آمده کشتنی است یا باید تبعید (شهر بدر) شود - اردو یادگار عهد زرین اتحاد مسلمانان و هنود است - روح و خیال از مسلمانان و ساخت جسم از هندی است —

بنابرین اطلاع از ادبیات عصر حاضر برأے اردو دارا ے اهمیت است هردو دورهٔ تکامل را دارند طے می کنند - هر دو اشتراک روحی دارند - بالآخره تجددات فارسی را باید بغور مطالعه کرد - هرچه براے اردو مفید است باید اختیار نمود و هرچه زیان بخش است پرهیز ازان لازم است —

مسافرت دانشمند محترم آقا محمد اسحاق داراے اهمیت است -

'اول' محققانه براه راست افتاده در محیط ادبیات زنده رفته اند -

'دوم' تنها ذوق علمی، شوق مشاهده، حس حقیقت جوئی محرک ایں سفراست-

'سوم' سفر نتیجهٔ تحقیقی خود داده وسه جلد بزرگ ادبیات عصر حاضر فراهم وجمع آوری کرده اند —

'چہارم' ایمان اول محققی است کہ ادبیات زبان حال را محققانہ در ایران جمع کردہ و ہندوستان وممالک دنیا را بآن آشنا می کند -

آوازۂ چہار جلد تاریخ ادبیات ایران تالیف اُستاد بزرگ مرحوم ادورد برون (Edward Brown) بگوش ادب پژوہان رسیدہ و بیشتر آن را خواندہ اند - استاد مرحوم از آنجا کہ دست رس تحقیق بودہ آغاز کردہ' وہ بزمان حاضر خاتمہ میدہد و زندگئی مرحوم ہمین جا انجام یافت - ادبیات زبان حاضر منتظر استاد و محققیء دیگر بود - در واقع این سہ جلد ادبیات عصر حاضر متمم و مکمل چہار کتاب استاد برون مرحوم است - لاکن این چہار جلد تاریخ ادبیات است و سہ جلد عصر حاضر ادبیات است و تاریخ و تذکرۂ مختصر و مفیدی ہم دارد - امید است آیندہ جنبۂ تاریخی بیشتری پیدا کند —

کتاب "سخنوران عصر حاضر" دارائی سہ جلد است - جلد اول طبع و مجلد شدہ زیر مطالعۂ نگارندہ است - جلد دوم زیر طبع است - و این ہر دو در ادبیات شعری است - و جلد سوم فقط ادبیات نثری است - ہر سہ جلد (نظم و نثر) ادبیات عصر حاضر است یعنی دورۂ مشروطہ (از سال ۱۳۲۵ عدل مظفری) لاکن تا ہر سہ جلد ملاحظہ نشود آغاز حقیقیء این ادبیات نمی توان نوشت - تبصرہ و انتقاد کامل ہم بعد از مطالعۂ سہ جلد ممکن است - کنون تنہا تبصرۂ مختصری دربارۂ جلد اول کہ مطالعہ شدہ است ذیل نگاشتہ می شود —

(۱) کاغذ ' طبع ' خط ' عکس ' جلد بندی آبرومندانہ است - واین نیز یکے از علامتہاے نمایانِ بیداریِ مشرق است - کارکنان مطبعۂ جامعۂ ملیہ دہلی مستحق تحسین و آفرین ہستند - کتاب با سلیقۂ خوب و اسلوب مرغوب مراحل زیبائی را طے کردہ و بحد کمال رسیدہ است —

(۲) دارائی تقریظی است از استاد معظم جناب جمال زاده وایشان باچشم
حقیقت شناس اظہار حقائق کرده اند —
(۳) دیباچۂ خود جناب محمد اسحاق است کہ نظریات محققانۂ خود را مفید
و مختصر بیان نموده اند —
(۴) انتخاب قسمت اول از اشعار 'سخنوران عصر حاضر' کہ موضوع حقیقی
این تبصره است کنون تبصرۂ مختصری نوشتہ وانتقادِ سرسری نموده
قدر و قیمتِ ادبیِ کتاب بہ نظرِ ادب پژدهان می رساند —

حسنِ انتخاب

نگارنده ایرانی' معلم' هر از دو سہ سال یک دفعہ تجدید عهد کرده
رهسپارِ ایران شده و در شہر ها و ایالات گردش نموده است و چندین
بار در طہران قریب دو سال توقف داشتہ است و با بعضی شعرا آشنا' و با
اشعار عصر حاضر باخبر - و خود در همین دوره نشو و نما یافتہ است -
نگارنده انتخاب را دیده خوبی و زیبائی آن تعجب خیز و طرب انگیز است -
تعجب خیز است کہ چگونہ یک نو وارد توانستہ است با صدها ادبا و شعرا
آمیزش کند و عالم ادبیات آنان را جولانگاهِ نظر محققانۂ خود نموده و
نقشۂ روحیِ ایشان را با مشقتها برداشتہ باین ارزانی در عالم ادبیات
نمائش دهد - ازین جہت طرب انگیز است کہ بعد از ملاحظہ و مطالعۂ کتاب
روشن می شود کہ محقق باوجدان و طبع سلیم و در حسن انتخابات بہ احسن
وجوه کامیاب است - و اسبابِ کامیابی را همہ آماده کرده اند —

اول جناب منتخب در فارسی متبحر' دوم در دارالفنون کلکتہ استاد
بزرگ فارسی' سوم محرک ذوق علمی و اشتہاے صادق است' چہارم توجہ
بخود ایران کردن' پنجم مشرقی و اردو زبان' ششم اشتراک اخلاقی و

ادبی، هفتم ندیده باید گفت با اخلاق عالمانه موردِ توجهٔ عموم ادباء شده، و بواسطهٔ اشتهاے صادق شبانه روز رنج کشیده و آرام را برخود حرام کرده اند - تنها یک حسِ حقیقت طلبی بر وجود ایشان فرما بوده است -

قدر و قیمت ادبیِ کتاب

انقلابات سیاسی، آزادی، فکری، تجددی، اخلاقی، تمدنی، اجتماعی، نیز از کتاب تا اندازهٔ میتوان بدست آورد - و بالا تر از همه درجه انقلاب و تغیراتِ ادبی میتوان کشف کرد و دانست و فهمید که ادبیات فارسی راه مشی خود را تغیر داده است و از عالم تنگ و تاریک بیرون آمده در جهانِ روشن و گشاده پا گزاشته است و کم کم دارد خود را به سرِ منزل آیندهٔ خویش نزدیک می نماید - امید است بحدّ کمال رسیده در فضاے علمی یک ملت هم آهنگ و یک تودهٔ یک نواخت بار آورد —

انقلابات و تغیرات زبان فارسی (زبان شعری)

یک جهتی و یک نوائی و عمومیت زبان است - و این وجه داراے اهمیت فوق العادة است و باید با نظرِ عمیق آنرا نگریسته در اطراف آن سخن سرائی کرد - پیش ازین دوره زبان فارسی اسیر دسته بندی و گرفتار پنجهٔ ادباء و شعرا بود و طبقهٔ شعرا صاحب امتیاز و فعال مایشاء بودند - علماے دین را مذهبی، شعرا را شعاری، منشیها را شیوهٔ و ادباء را دابی، دولتیان را تسلطی خاصی بود - عوام یک جادهٔ ساده و راهی هموار و روشی طبیعیِ خدا دادی داشتند - زبان هم مانند مذهب سروکارش به دسته بندی کشیده بود - نشیب و فراز، پستی و بلندی زبان به نظر خوانندگان رسید - در زمان محمد شاه (۱۲۵۰ تا ۱۲۶۴) بدستیاری چند نویسندهٔ بزرگ تا اندازهٔ خوبی زبان هموار و یک رخه گردیده بود به پائمردیِ "قائم مقام" و "فاضل خان

کروسی" و چند استاد دیگر سادہ نویسی و مطلب نگاری بروے کار آمدہ بود - و بہ کاستنِ برگ و شاخ انبوہ باغ سخن آرائی تر و تازگئی نوی یافت - و این روش پیش رفت کردہ در آغاز (۱۲۶۲ھ) ناصرالدین شاہ و وزارت میرزا تقی خان یک دفعہ جنبش خود را تیز نمود - اصطلاحات ملکی میرزا تقی خان، افتتاح دارالفنون (کالج)، آشنائی بافرنگ، شناسائی زبان فرانسہ، ہمہ دست بہم دادہ راہِ تغیرات و ترقیات وسیع شد - افسوس باز ہم افسوس کشتہ شدن مرحوم میرزا تقی خان، چرخ ترقیات را از کار انداخت و حرکت ادبی نیز سست گردید - خلاصۂ این مطلب از موضوع بحث بیرون است - مقصود این بود کہ یادآوری شود کہ ادب جدید دورۂ مشروطہ دفعتاً و ناگہانی پیدا نہ شدہ است عوام در ہر چیز خوف زدہ شدہ اند و از چہار جہت خواص بر ذہن سادۂ عوام حملہ می کردند - (۱) از جہتے دور باش شاطران استبداد - (۲) از جانبے کور شو علم برداران شریعت - (۳) از سمتی قلنبہ گوئی ادیبان - (۴) از طرفے مشکل تراشیِ شاعران، ناچار طبیعت عوام کند و ذہن شان کور شدہ بود - بہ شنیدن و نہ فہمیدن و خواندن و نہ سنجیدن عادت کردہ بودند بہترین تعریف عوام براے واعظ آن بود، سبحان اللہ خیلے عالم است، کسی حرفش نمی فہمد - این حرف را با سادگی براے بزرگواریِ واعظ می زدند در واقع درست می گفتند - واعظ خودش ہم کلام خویش نمی فہمید گویا نافہمی ہم مانند فہم محتاج استاد است و نادانی ہم مثل دانائی از بزرگ بکوچک میرسد - در حقیقت چنین است عوام حق دارند رفع تہمت از خود نمودہ در مقام مدافعہ بر آمدہ بگویند - درست است نافہمی و نادانی بیماری است و متعدی می باشد مگر از بزرگ بکوچک رسیدہ، از بالا بپائین آمدہ است، عرض خاص است لاکن مرض عام شدہ، آب از سرچشمہ گِل آلود است -

برائے استقلال مملکت وجود عوام لازم شد لہذا شعراء بزبان ایشان و برائے ایشان اشعار ملی و مصائب مملکتی سرودن گرفتند - ہیچ مملکتی بدون پشتبانیء اکثریت بمقصود نمی رسد و در واقع اکثریت مالک ملک است و اکثریت ہمیشہ زندہ است و زبان اکثریت زبانی است کہ قابل بقا و ارتقا است - پس باید اولاً زبان را یک جہت ساخت و ہمزبان با عوام شد بعد شروع بمقصود نمود - ادباء' خطبا' شعراء ایران مطلب را درک نمودہ با عوام یک جہت و ہمزبان شدند - و ہمزبانی اثر خود را کاملاً بخشید و ملت جاہل نادان و بے خبر بہ جنبش افتاد - در مملکت شعری' ملت حساس شعرہائے ملی را ورد خود ساخت' ذوق شعری آن قوی شد و اشعار قلوب آنہا را مسخر کرد —

اشعار عشقی' عرفی' ایرج میرزا' سید اشرف الدین' مانند برق زبان زد عام و خاص گردید - تعجب اینجا است کہ بہمان درجہ کہ خواص ازین اشعار متاثر می شوند و چند درجہ بیشتر عوام متالم می گردند و می فہمند این گونہ اشعار بایک لہجۂ نمکین و زبان سادہ احتیاجات ملی' مصائب مملکتی را با احساسات ملی و عواطف قومی ذہن نشین عوام می کند و این بزرگ ترین مدرسہ است —

طلوع مشروطہ و آزادی' پیش آمد یک مقصود عمومی' مصائب ملی' احساس احتیاجات مملکتی' ملت ایران را باہم متحد کردہ ہم زبان ساخت و زبان فارسی بایک سرعت شگفت انگریزی گریبان خود را از دست تفرقہ بیرون آوردہ در شاہراہ یک جہتی افتاد - امید است آیندہ یک فضائے علمی' یک محیط ہموار' یک ملت یک ساختی را بار آورد - طلوع مشروطہ زبان را آزاد و قلم را توانا ساخت - پیش آمدن یک مقصود عمومی نویسندہ و

گوینده را بسیار کرد - مصائب ملی خواننده و شنونده را فراوان نمود - احساس احتیاجات مملکتی مشیِ زبان را تغیر داد و شعرا از مقام خدائی خود پائین آمده همزبانِ عوام شدند - مراعات ذهن آنها نموده بفهم ایشان شعر سرودند - ادیبان و گویندگان سخنان خود را عوامانه ادا نمودند کم کم الفاظ عامیانه و بازاری راه و رخنه یافته زبان زد ادبا و شعرا شده زبان را ساده و شیرین تر گردانید - عوام نیز با شوق و ذوق نزدیک آمده و برائے مطالب فهمی آماده شدند و از عالم تنگ و تاریک بیخبری بیرون آمده به دنیائی نوی داخل گشتند - اشعار وطنی ' سرود هائے ملی بهترین معلم ایشان شد ایشان را سر گرم و پر جوش ساخته هنگامۀ انقلاب را گرم کردند - برائے آزادی و آبادی نعرۀ " زنده باد انقلاب " از جگر برکشیده رستخیز عام و محشر ملی بر پا شد - با پشت کاریِ خواص و پشتبانیِ عوام کاخ استبداد سرنگون گردیده سلطنت ملی شد ——

وطنیات

ادبیاتِ شعریِ فارسی پیش از مشروطه یک دنیای پهنا ورِ ممتازی است و پهنا وریِ آن زیاده تر از درازی است - یعنی موضوع کوتاه ' مضمون کم و بد بختانه مکرر است بعبارت دیگر مضمون و موضوع کم و شاعر بسیار - از اینجا است که یک موضوع کوچک خسرو شیرین ' لیلی مجنون ' فرهاد شهرین ' یوسف و زلیخا ' میدان مقابله و مبارزۀ شعرا است و شعراء بزرگ برائے یک موضوع کوچک بجان هم افتاده اند گویا عالمِ خیال هم مثل عالمِ معیشت تنگ شده و میدان تنازع البقا پیش آمده است لاکن در حقیقت مسئله تنازع للبقا فقط برائے نان نیست اگر هست برائے جان است و جانِ شعری بالا تر از جانِ نانی است - بد بختانه بیشتر شعراء ایران برائے نان شعر می

گفتند وهر دو میدان برائے آنان تنگ بود - تمام افراد بلی آدم برائے نان جان می دهند - آدم برائے نان خام (گندم) دست از نعمتهائے بهشت کشید - اگر اولاد او برائے گندم پخته (نان) بجانِ یکدیگر بیفتند جا دارد - سخن کوتاه ' مضمون محدود ' استاد معدود ' نابغه کمیاب ' شاعر بسیار ' دائرۂ شعر وسیع تعریف شاعری ازان وسیع تر است وکشور شعر حد وکنارہ ندارد - آزادی وصلاے عام است —

هر که خواهد گو بیا و هر که خواهد گو برو

گیر و دار و حاجب و دربان درین درگاه نیست

بلی ولی استاد کم است و نابغه نادر نه تنها در دنیائے شعر بلکه در هر چیز و هر جا و همیشه نابغه کمیاب است - گویا روز گار درین باره امساک و بخل کرده است فقط وضع جغرافیائی سبب کمیابیِ شعراء بزرگ نیست بلکه سبب اصلی قناعت و کفایت شعارِیِ طبیعت است - فقط چند استاد بزرگ نابغۂ دنیائے ادبیات پیش از مشروطه شدند و همین چند تن نابغه کشور ادبیات را فتح کرده اند وهمه مستحق تکریم و احترام هستند - و دیگران هم در مرتبۂ خود خدمت کرده اند و مستحق تعریف می باشند - درین جا فقط دو نابغۂ بزرگ ذکر می شود —

فردوسی نه تنها نابغۂ ادبیات است بلکه بواسطۂ ایجاد موضوعِ مهم ومفیدی ' دارائے مقام بلندی است - این نابغۂ نادره ' بقاء ملت ' زبان ' آداب ورسوم ملی ' تاریخ مختصراً هر چیز ملی ووطنی را درنظر گرفته پس یک عمر جانکاهی نموده وسراپا خدمت به ابنائے وطن کرده است وملت ایران را از پامالی و تباهی نجات داده است - سعدی نیز تنها نابغۂ شعری نیست بلکه بایک طرز بلیغ و یک اسلوب شیوا اصلاحات ملی را

پیش نہاد خود نمودہ است و بادشاہ و وزیر' رند و زاهد ' جوان و پیر' توانگر و فقیر ' تعلیم و تربیت ' اخلاق' ظلم و عدل ' عشق و جوانی ' ضعف و پیری ' عواطف ' احساسات ' مختصراً احوال ملی را در نظر گرفته با یک فصاحت سادہ و بسیار مختصر موثری درپئے اصلاح بر آمدہ است و توجهِ خاص و عام را بخود معطوف داشته - ایجاد این گونه موضوع در وقت ضرورت از مختصات سعدی بودہ و حقیقتاً او مصلح است -

وضع جغرافیائے ایران و آب و هوا' باغها' گلها و گلستانها ' و انقلابات سیاسی همیشه شاعر پیدا کردہ است لاکن مخاطب دلیل منطقی می خواهد - در همین زمان حاضر باندازۂ ماخذ درست بدست آمدہ است که میتوان یک کتابچه نوشت بلکه گواہ تاریخی از زمان هخا منشی بدست داریم تقریباً ۳۴۰۰ پیش از میلاد عیسیٰ - از روئی ادلۂ تاریخی شعر قبل از اسلام در ایران موجود بودہ است لاکن یک نکتۂ مهمی دیگر هم ایرانیان قدیم در شعر ملحوظ می داشته اند و آن توافقِ اوزانِ شعری با موسیقیِ ملی است - این رعایت درین عصر حاضر کم کم دارد لحاظ می شود - امید است آیندہ وسیع شدہ اثرات مسرت انگیزی بدهد - آن هم یکے از شاہ کار هائے عصر حاضر است که زبان را عمومی و یک جهت می کند و روح عوام را تکان دادہ آنان را برائے مبارزۂ زندگانیِ ملی آمادہ می نماید - اشعار جدید به سبب هم آهنگی با موسیقی در خانه و کوچه و بازار و محافل ادب و بزمِ عیش قلوبِ عامه را جذب کردہ است —

طلوع مشروطه و پیش آمدن یک مقصود عمومی' احساس احتیاجات وطنی ' مصائب مملکتی هزار ها موضوع مفید بدست شعراء می دهد

و یک کشور و سهم بزرگی باسم ایران ' وطن به آنها حواله می کند - کنون موضوع بسیار مضمون بے شمار است - ازینجا است که شعار این عصر همه وطنی شده است - قصیده ' غزل ' قطعه ' ترجیع بند ' رباعی ' اوزان جدیده هر کدام در یک موضوع مهمی ' یک مضمون مفیدی سروده شده است - از پیر هشتاد ساله (ادیب پشاوری) تا جوان نو خیز (حسام زاده) همه با یک گرمیء حقیقیء وطن و ابناء آن را در نظر دارند و همه موضوع تازه و مضمون نو ایجاد می کنند - سخن کوتاه کنون شاعر کم و مضمون بسیار است —

سیل شعر گوئی با جوش و خروش سرازیر شده است و راه هائے نو پیش گرفته جویائی مجراهائے طبیعی است و کنون مضمون بے حد ' موضوع بے انتها ' باز شاعر بسیار ' استاد کم و جهان ادب تشنهٔ وجود نابغه است —

جلد دوم و سوم ' سخن وران عصر حاضر ' به نظر نرسیده است و نگارنده نا چار است در حدود جلد اول تبصره بنویسد بنا برین کنون فهرست مهمی از انقلابات ادبی نوشته مقاله ختم می شود -

انقلاب ادبی زبان فارسی

(۱) یک رخی و یک جهتیء زبان -

(۲) وطنی شدن عالم نظم -

(۳) توافق با موسیقی-

(۴) راه و رخنه یافتن الفاظ و محاوراتِ عوام در جهانِ نظم -

(۵) ساده گوئی-

(۶) تسلسلِ مطلب -

(۷) علل و اسباب ظاهر کردن و نتیجه گرفتن -

(۸) ایجاد موضوع و مضمون بکر مفہوم وطنی -

(۹) گرمیٔ حقیقی -

(۱۰) اوزان نو -

(۱۱) لازم می نماید برائے برخے از مطالب مقالہ و این فہرست نمونۂ از نظم جدید نوشتہ شود لاکن کتاب ' سخنوران عصر حاضر ' خود نمونہ است —

سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ

از اڈیٹر

سر سید جامع حیثیات شخص ہوے ہیں - یہ وہ زمانہ تھا جب سوسائٹی کا شیرازہ بکھر چلا تھا - زندگی کا ہر شعبہ دبدھا کی حالت میں تھا - دو تہذیبوں کے ٹکرانے سے اس تذبذب میں اور اضافہ ہو گیا تھا اس وقت ایک ایسے مخلص زمانہ شناس' اور ثابت قدم شخص کی ضرورت تھی جو قوم کی خفتہ اور مردہ قوتوں کو جگاے' ان اوہام اور اسقام کو دور کرنے کی کوشش کرے جو گزشتہ تمدن اور حکومت نے پیدا کردیے تھے - اور اقتضاے زمانہ کے لحاظ سے ان کی ضروریات کو پورا کرے اور جدید حالات کی رو سے ان کی روش کو بدلے - سر سید نے اگرچہ زندگی کے ہر اہم شعبے کی طرف توجہ کی لیکن ان کا سب سے بڑا کام تعلیمی اور علمی تھا - اور اسی کام کا ایک جز سائنٹفک سوسائٹی کا قیام تھا - خود یہ نام اس تغیر کی خبر دے رہا ہے جو اس وقت عمل میں آرہا تھا - یہ علمی سعی اردو زبان کے سلسلۂ ارتقا کی ایک کڑی ہے اور اس لیے اس کا ذکر اردو زبان کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے ضروری ہے —

سر سید نے سنہ ۱۸۹۳ ع میں ایک تحریر اس عنوان سے کہ ' التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب ترقیِ تعلیم اہل ہند " چھاپ کر شائع کی

جس کا خلاصہ مضمون یہ تھا کہ ہندوستان میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے چھاپے *"- یہ تھی اصل بنیاد سائنٹفک سوسائٹی کی - چنانچہ دوسرے ہی سال انہوں نے اس خیال کو عمل میں لانے کی کوشش کی —

۹ جنوری سنہ ۱۸۶۴ ع کو سر سید نے غازی پور میں جہاں وہ صدرالصدور تھے' اپنے مکان پر ایک جلسے کا انعقاد کیا جس میں یورپین اور دیسی اصحاب کا اچھا خاصا مجمع تھا - یہ جلسہ سوسائٹی کے قائم کرنے اور اس کے اغراض و مقاصد بیان کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا - اس میں لفٹننٹ کرنل گریہم نے (جو سر سید کے بڑے دوست تھے اور اس وقت غازی پور میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے) اور سر سید نے بہت مدلل اور معقول تقریریں کیں —

سر سید کا یہ خیال بالکل صحیح تھا اور اب بھی تقریباً ۷۰ سال گزرنے اور مغربی تعلیم کی بکثرت اشاعت ہونے کے بعد بھی وہ خیال ویسا ہی صحیح ہے کہ علوم جدیدہ کی اشاعت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ علمی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ نہ کی جائیں - مولانا حالی لکھتے ہیں کہ" انہوں نے اس بات کو انگریزی تعلیم کے پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا "- مولانا نے اس سوسائٹی کے مقاصد کو مختصر طور پر نہایت خوبی سے ان الفاظ میں ادا کیا ہے :—

" جو (یعنے سائنٹفک سوسائٹی) اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ لٹریری اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کر مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جائے' علمی مضامین پر

* حیات جاوید حصۂ اول صفحہ ۱۲۱

لکھچو دیے جائیں ' رعایا کے خیالات گورمنٹ پر اور گورمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعے سے ظاہر کیے جائیں جو اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شایع ہوا کرے ' ہندو مسلمان اور انگریز تینوں قوموں کے ممبر اس میں شامل کیے جائیں اور اس طرح قومی مغائرت اور مذہبی تعصبات اور جو جھجک ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ہے اس کو آهستہ آہستہ کم کیا جاے" ابتدا ہی میں ۱۲۹ ممبر ہوگئے - جس میں ہندو مسلمان انگریز سب شریک تھے —

اسی سال (یعنے سنہ ۱۸۶۴ ع میں) سر سید غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڑہ آگئے - "چونکہ غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کا ان کی غیبت میں چلنا ناممکن تھا ' اس لیے سوسائٹی کا تمام سامان اور اسٹاف وہ اپنے ساتھہ علی گڑہ لے آے - مسٹر ولیم جنکس بریملی جو اس زمانے میں علی گڑہ کے جج تھے ' سرسائٹی کے پریسیڈنٹ قرار پاے "- اور اسی وقت سوسائٹی کے لیے ایک مستقل مکان بننے کی تجویز ہوئی اور سر سید کی کی نگرانی میں عمارت کی تعمیر شروع بھی کردی گئی - مکان کی تعمیر اور آرائش اور کتب و آلات وغیرہ پر تقریباً تیس ہزار روپے کی لاگت آئی اس کا سنگ بنیاد لفتننٹ گورنر شمال مغرب (اے - ڈریمنڈ) نے ۳ نومبر سنہ ۱۸۶۴ع کو رکھا تھا اور ۳۰ مارچ سنہ ۱۸۶۶ ع کو جب عمارت بن کر تیار ہو گئی تو مسٹر ولیمس کمشنر قسمت میرتھہ کے ہاتھہ سے اس کا افتتاح ہوا - ڈیوک آف آرگائل وزیر ہند اس کے پیٹرن (سر پرست) اور اے - ڈریمنڈ لفتننٹ گورنر شمال مغرب وائس پیٹرن قرار پاے - اولین سکریٹری لفٹنٹ کرنل گریہم ' اس کے بعد سر سید ہوے-

اگرچہ سوسائٹی کا پہلا قانون سنہ ۱۸۶۴ ع میں بمقام غازی پور بنا لیکن جب سوسائٹی کا دفتر علی گڑہ میں منتقل ہو گیا تو سنہ ۱۸۶۷ ع میں اس میں

کسی قدر ترمیم کی گئی- سوسائٹی کے اغراض اور قواعد حسب ذیل قرار دیے گئے --

(لقب اور مقصد)

اس مجمع کا نام سینٹیفک سوسائٹی یعنے علمی سوسائٹی کہا جائیگا اور مقصد اس کا یہ ہوگا:—

(۱)-ان علوم و فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان میں یا یورپ کی کسی اور زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھہ سکتے ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں -

(۲) - جب کبھی سوسائٹی مناسب سمجھے تو کوئی ایسا اخبار یا گزٹ یا روزنامچہ یا میگزین وغیرہ چھاپ کر مشتہر کرنا جس سے ہندوستانیوں کے فہم و فراست کی ترقی متصور ہو —

(۳) - ایشیا کے قدیم مصنفین کی کم یاب اور نفیس کتابوں کا تلاش کر کر بہم پہنچانا اور چھاپنا —

(بناوٹ سوسائٹی کی)

(۴) - سوسائٹی میں (اول) معاون ممبر (دوسرے) آنریری ممبر (تیسرے) رفقاے سوسائٹی ہوویں گے اور سوسائٹی کے پیٹرن یعنے مربی اور وائس پیٹرن یعنے نائب مربی بھی مقرر ہوا کریں گے —

معاون ممبر دو قسم کے ہوں گے (اول) ممبران حضوری یعنے وہ ممبر جو ایسے مقام میں یا اس کے قریب رہتے ہوں جہاں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا ہو- (دوسرے) ممبران مکاتبت یعنے وہ ممبر جو اس مقام سے جہاں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا ہو فاصلے پر رہنے کے سبب سوسائٹی کے جلسے میں شریک نہ ہوسکیں اور بذریعہ خط و کتابت سوسائٹی سے ارتباط رکھیں —

تعداد غیر محدود - چندہ دو روپیہ ماہانہ -

آنریری ممبروں کی تعداد دس سے اور رفقاے سوسائٹی کی تعداد پانچ سے زیادہ نہ ہوگی —

صاحبان ڈریکٹرز پبلک انسٹرکشن بنگال اور شمال مغرب اور سنٹرل انڈیا اور اودہ و پنجاب موجودہ وقت بشرطیکہ وہ قبول کریں آنریری ممبر * ہوں گے —

رفقاے سوسائٹی ایسے شخص ہوں گے جو بسبب تحصیل علم یا علوم کے نہایت نامی ہوں مگر ممبری کے عہدہ پر مقرر ہونے کا ان کو کچھہ خیال نہ ہو —

کونسل مشیر کے ذمہ ترجمہ و ترتیب کتب، ترجموں کی پسندیدگی و ناپسندیدگی نیز یہ تجویز کہ ترجمہ اردو، فارسی، عربی، ہندی میں کیا جاوے یا کن کن زبانوں یا کس زبان میں کیا جاے —

کونسل کارپرداز - ذمہ دار منتظم اور ایک کتب خانہ کا قیام —

جو عمارت سوسائٹی نے علی گڑہ میں بنائی وہ علی گڑہ انسٹیٹیوٹ کہلائے گا اور جہاں تک ممکن ہوگا ہر قسم کی عجیب عجیب چیزیں اس مکان میں عجائب خانہ کی غرض سے جمع کی جائیں گی اور ان چیزوں کے حالات وقتاً فوقتاً مشتہر کیے جایا کریں گے —

۳۰ مارچ سنہ ۱۸۶۶ ع سے انسٹیٹیوٹ گزٹ جاری ہوا - یہ اخبار پہلے ہفتہ وار تھا پھر ہفتے میں دو بار نکلنے لگا - اڈیٹر خود سرسید تھے - مولانا حالی نے اس اخبار کے متعلق جو راے لکھی ہے وہ اس قدر معقول اور صحیح ہے کہ اس کے بعض حصوں کا یہاں نقل کردینا کافی ہے -

"اول اول سرسید زیادہ تر اس میں پولٹیکل معاملات پر مضامین

---

* فرانس کے گارساں دتاسی بھی سوسائٹی کے آنریری ممبر بنائے گئے -

اور نوٹ لکھتے تھے؛ اس لیے اس کی ابتدائی جلدوں کو ان کے پولیٹکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جاسکتا ہے - اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین اردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے؛ اس لیے اس سے انگریز اور ہندوستانی یکساں فائدہ اٹھا سکتے تھے - اس کا خاص مقصد گورمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولیٹکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا - اس کی ابتدائی جلدوں کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی لباس میں اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کرکے دونوں قوموں کو ملانا چاہتا ہے ــــ

اس میں سوشل، اخلاقی، علمی اور پولیٹکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے - جب تک سرسید کی توجہ دوسری جانب مائل نہیں ہوئی، علاوہ اُن لیڈنگ آرٹکلوں کے، جو وہ خود لکھتے تھے، انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ آرٹکل جو معاملات ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے برابر ترجمہ ہوکر چھپتے رہتے تھے - ہندوستان کے طریق معاشرت یا تعلیم یا کسی علمی یا تاریخی تحقیقات کے متعلق جتنے لکچر سوسائٹی میں دیے جاتے تھے وہ سب اس کے ذریعے سے شایع ہوتے تھے ــــ

اگرچہ یہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک عمدہ آلہ رہا ہے اور اول اول کئی سال تک جس قدر زمانۂ حال کی نئی اطلاعیں اس کی بدولت ہندوستانیوں کو حاصل ہوتی رہی ہیں اُن کے لحاظ سے یہ کہنا کچھہ مبالغہ نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات

کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اس پرچے کے اجرا سے شروع ہوئی ہے - مگر اس کے ساتھہ ہی پولیٹکل معاملات میں جو وقعت اور اعتبار اس اس پرچے نے گورنمنٹ اور حکام کی نظر میں حاصل کیا وہ آج تک کسی اخبار نے حاصل نہیں کیا —

... ...

ایک خاص وصف ' جو اس اخبار کے ساتھہ مخصوص تھا اور جو اس کو ہندوستانیوں کے عام انگریزی اور دیسی اخباروں سے ممتاز ٹھیراتا تھا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنے طرز تحریر میں برخلاف اپنے تمام ہم عصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقے یا کسی خاص شخص کی دلازاری روا نہیں رکھی - اس نے اپنے گاہکوں کے خوش کرنے کے لیے ' جو ہمیشہ نوک جھوک اور چھیڑ چھاڑ سے خوش ہوتے ہیں' سنجیدگی اور متانت کو کبھی ہاتھہ سے نہیں دیا - اس نے ہندوستان کی کسی قوم کی نسبت دوستی اور خیر خواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا - کبھی کسی ہندو یا مسلمان ریاست یا اس کے اہلکاروں پر زہر نہیں اگلا - ہندو مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ بے تعلق رہا اور اگر کبھی کچھہ بولا تو دونوں کو صلح و آشتی کی نصیحت کی " —

یہ سب سچ ہے لیکن یہ اُسی وقت تک تھا جب تک کہ کالج اور دوسرے کاموں کا ہجوم نہیں ہوا تھا - آخر میں تو یہ " ماخوذ از پانیر " ہوکے رہ گیا تھا - لیکن جب کوئی خاص مسئلہ یا اہم معاملہ آجاتا تھا تو سر سید خود بڑے پُرزور مضامین لکھتے تھے —

ابتدا میں منشی محمد یار خاں اڈیٹری کا کام کرتے تھے اور منشی چکھن لال انگریزی اخبارات کا ترجمہ کرتے تھے - مولوی فیض الحسن اور

بابو گنگا پرشاد مترجم کتب تھے - اجرت پر بھی کام ہوتا تھا - کل عملہ پانسو روپیہ ماہانہ کا تھا —

ایک کتب خانہ بھی قائم کیا گیا اور آلات علمی اور کلوں کے نمونے فراہم کیے گئے اور لکچروں کا سلسلہ قائم ہوا - ڈاکٹر کلکلی ہر مہینے ایک لکچر ' نیچرل سائنس پر دیتے تھے اور عملی آلات سے جو سوسائٹی میں موجود تھے حاضرین کو تجربے دکھاتے تھے —

سوسائٹی کی ترقی اور فروغ کا سارا دار و مدار سرسید پر تھا - انہوں نے اپنی ذاتی کوشش اور محنت اور سالانہ چندوں اور عطیات سے سوسائٹی کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا - اپنا ذاتی پریس جو "تبئین الکلام" کے چھاپنے کے لیے خریدا تھا ' سوسائٹی کے نذر کردیا - جون سنہ ۱۸۶۶ ع میں جب نواب سکندر بیگم والیۂ بھوپال نے یہ سنا کہ سید احمد خاں نے ہندوستانیوں کی بہبودی کے لیے یہ سوسائٹی قائم کی ہے تو انہوں نے بطور اظہار خوشنودی ایک الماس کی انگوٹھی قیمتی ایک ہزار روپیہ سرسید کو بھیجی - سر سید نے ایک جلسۂ عام میں یہ انگوٹھی سوسائٹی کو دے دی - اسی طرح محض سوسائٹی کو فائدہ پہنچانے کے لیے سر سید نے فوجداری اور کلکٹری کے مختاروں اور وکیلوں کو قانون پر لکچر دینے شروع کیے اور اس سے جو فیس وصول ہوتی تھی وہ سوسائٹی کے نذر کردیتے تھے —

گورنمنٹ اور روسا امرا اور حکام نے بھی اس کی معقول امداد کی - گورنمنٹ نے تین ایکڑ تین روڈ اور تیس پول زمین سرکاری تعمیر مکان کے لیے اور ایک باغ سرکاری علم فلاحت کی ترقی اور امتحان کے لیے عطا کی - مہاراجہ جودھپور نے سو روپیہ سالانہ ' مہاراجہ کپور تھلہ نے پچاس روپے ' مہاراجہ جے پور نے پچاس اور نواب رام پور نے سو روپے سالانہ

امداد مقرر کی - وائسرائے اور لفٹننٹ گورنر وغیرہ نے چندوں سے مدد کی - سرجان لارنس کو خاص توجہ تھی - مسٹر ڈریمنڈ لفٹننٹ گورنر شمال مغرب اور مکلوڈ لفٹننٹ گورنر پنجاب نے بھی چندے دیے - نواب کلب علی خاں نے بارہ سو روپے کی ایک نقرئی کرسی سوسائٹی کو دی مہاراجہ الور اور مہاراجہ اندور اور نواب تونک نے بھی عطیات دیے - مہاراجہ بنارس کو بھی اس سے خاص دلچسپی تھی- عنایت اللہ خاں رئیس بھیکم پور نے دو سو روپے تعمیر چاہ کے لیے دیے - سر آکلنڈ کالون، مسٹر سیپٹ کلکٹر میرتھہ اور مسٹر کیمسن ڈائرکٹر تعلیمات بھی اس کے بڑے معاون تھے - سر سید کی کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ سالانہ چندے اور اخبار کی قیمت کی تعداد دس ہزار آتھہ سو پچاس تک پہنچ گئی —

۱۵ - اگست سنہ ۱۸۶۷ع میں جب سر سید عہدۂ جج سمال کاز کورٹ پر ترقی پاکر علی گڑہ سے بنارس چلے گئے تو سوسائٹی کا تمام کاروبار راجہ جے کشن داس سی- ایس- آئی کو جو اس زمانے میں علی گڑہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے سپرد کیا گیا اور انھوں نے بڑی توجہ سے اس کام کو سرانجام دیا - لیکن سر سید بنارس میں رہ کر بھی برابر سوسائٹی کی اعانت کرتے رہے اور اُن کے مضامین سوسائٹی کے اخبار میں شایع ہوتے رہے —

"سنہ ۱۸۶۷ میں سر سید بتقریب تعطیل دسہرہ بنارس سے علی گڑہ میں آئے اور ضلع علی گڑہ کے اکثر زمینداروں پر اس بات کو ظاہر کیا کہ اب تک سوسائٹی کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے؛ کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اس کی آمدنی مستقل ہوجائے- بہت سے زمینداروں نے یہ تجویز کی کہ اِس ضلع کے تمام دیہات سے کم از کم ایک روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لیے سوسائٹی کے قیام کے واسطے مقرر کیا جائے؛ اور

اس کی شرائط واجب العرض میں ہر وقت بندوبست کے درج ہو جائیں تاکہ نسلاً بعد نسلٍ ہمارے وارثوں میں سے کوئی کچھہ عذر نہ کرنے پائے۔ چنانچہ ۱۲ اکتوبر سنہ ۶۷ ع کو سوسائٹی کے جلسے میں سر سید نے یہ تجویز پیش کی اور ایک فہرست زمینداران درخواست دھندہ کی مع ان کی عرضیوں کے اور مع تفصیل ۱۳۳ دیہات کے جارج ہنری لارنس کلکٹر ضلع علی گڑہ کی خدمت میں اپنی چٹھی کے ذریعہ سے بھیج دی تاکہ وہ اس کی تصدیق کرکے گورنمنٹ میں رپورٹ کریں۔ اور صاحب کلکٹر نے وہ تمام کاغذات گورنمنٹ میں اپنی رپورٹ کے ذریعہ سے روانہ کردیے۔ اس کا نتیجہ سوا اس کے اور کچھہ معلوم نہیں ہوا کہ اس کے جواب میں جو چٹھی پرائیویٹ سکرتری گورنمنٹ انڈیا مورخہ ۱۸ اکتوبر سنہ ۶۷ ع بنام سر سید وصول ہوی اس میں حضور وائسرائے کی طرف سے رضامندی ظاہر کی گئی تھی " * —

۹ — مئی سنہ ۱۸۶۸ ع کو سوسائٹی نے ایک اڈریس سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر شمال مغرب کی خدمت میں پیش کیا اور سوسائٹی کی درخواست پر سر ولیم میور نے وعدہ کیا کہ جو کتابیں دیسی زبان میں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کی جائیں گی ان میں گورنمنٹ ضرور امداد دے گی۔ چنانچہ ۲۰ — اگست سنہ ۱۸۶۸ ع کو گورنمنٹ شمال مغرب نے دیسی کتابوں پر انعام دینے کا اعلان کیا۔ "اگرچہ انعام سے کچھہ زیادہ آدمی مستفید نہیں ہوے اور اشتہار کی میعاد چند سال بعد گزر گئی لیکن اس اشتہار کا اثر اس تمام گروہ میں جو دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی کم و بیش لیاقت رکھتا تھا مگر اس لیاقت کو کام

* حیات جاوید حصہ اول صفحہ ۱۳۷ —

میں لانا نہیں جانتا تھا، برقی قوت کی طرح دوڑ گیا - انہوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدہ پہنچایا اور خود بھی حق تصنیف سے فائدہ اٹھانا سیکھ گئے - خصوصاً اردو لٹریچر صرف اس تحریک کی بدولت جو کہ اشتہار مذکور نے ملک میں عموماً پیدا کردی تھی تھوڑے عرصہ میں توقع سے بہت زیادہ ترقی کر گیا "* —

سر سید کی دور اندیشی سوسائٹی کے نام سے ظاہر ہے - اس زمانے میں جدید خیالات کی اشاعت اور سائنس کا ذوق پیدا کرنا بہت بڑا کام تھا - جب سوسائٹی علی گڑھ میں منتقل ہوئی تو اس نام کے متعلق اختلاف پیدا ہوا اور سر سید بھی کسی قدر مائل ہوگئے تھے کہ یہ نام بدل دیا جائے لیکن جب طریقہ و علم کاشتکاری اور علمی عجائبات کا رہنا طے ہوگیا تو یہی نام مناسب خیال کیا گیا اور آخر تک یہی نام قائم رہا -

سائنس کے لکچروں کے سلسلے کے علاوہ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے عملی تجربے بھی کیے گئے اور علم فلاحت کے اصول کے مطابق سوسائٹی کے باغ میں گیہوں بویا گیا اور جب تیار ہوگیا تو جلسے میں اس کا نمونہ دکھایا گیا - ایک ایک دانے میں ساٹھ ساٹھ ستر ستر شاخیں نکلیں اور بعض میں سو سے بھی زیادہ پھوٹ کر مثل پولے کے جھاڑ کے ہوگیا تھا - پودے کا طول ۴ فٹ ۸ انچ اور بال مع تور کے ۱۰ انچ لمبی تھی - نو قسم کے گیہوں لندن سے منگائے گئے - خود سر سید نے ایک ایک دانہ بونے کے لیے ایک آہنی نلی ایجاد کی اور علم فلاحت پر ایک رسالہ لکھنا شروع کیا -

مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی تالیف اور مغرب اور مشرق کی اعلیٰ درجے کی کتابوں کا ترجمہ اس سوسائٹی کا بہت بڑا مقصد تھا - علمی ذوق پیدا کرنے کا یہ

* حیات جاوید حصہ دوم صفحہ ۳۵ -

، بڑا ذریعہ تھا - سر سید نے پولیٹکل اکانمی ' نیچرل فلاسفی ' علم آب و ھوا کے
موں کی سفارش کی- کرنل جے ڈبلیو ھیملٹن نے پہلے ھیرو ڈوٹس کے تاریخ مصر کے
ہے کی اور بعد ازاں تمام تاریخ کے ترجمے کا مشورہ دیا اور لکھا کہ مقاموں اور
صوں کے ناموں کے معاملے میں بہ نسبت یونانی کے عربی زبان کی پیروی
، چاھیے اور جو تلفظ کسی لفظ کا یورپ یا ایشیا کی زبان میں مروج ھو
، اختیار کیا جائے - انگریزی زبان کی تقلید لازم نہیں - ھندی کے
ف ٹ اور ڈ کا استعمال نہ کیا جائے- ھیئت اور جیالوجی (ارضیات) کے
ے کی بھی رائے دی- دوسرے خط میں سفارش کی کہ ایک عمدہ
یخ مصر مسمی حسن المحاضرہ مصنفہ سیوطی ھے- ھشت بہشت کا نسخہ
بھیجا جو اِدریس بدخشی کی تصنیف ھے جس میں شاہ مراد کی
ت ۸۵۵ ھجری تک کے حالات ھیں - مصنف کے بیٹے ابوالفضل الاختری
سے ۹۸۲ ھجری تک پہنچایا ' لیکن یہ نسخہ اصل مصنف کا تھا جو
تک ھے - انہوں نے ھیرن صاحب کی تاریخ کے ترجمے کی بھی رائے دی-

خود سر سید نے دو کتابوں کی تالیف کا بیڑا اٹھایا - ایک تمام اردو
ِعہ کتب نظم و نثر کی فہرست کی ترتیب بطور تاریخ زبان اردو - اس
امور ذیل کی صراحت کی جائے گی —

نام کتاب - نام مصنف مع مختصر حال - زمانۂ تصنیف - کچھہ عبارت
نمونۂ طرز بیان اور بعض مضامین کا خلاصہ —

معلوم ھوتا ھے کہ اس کتاب کے لکھنے کی نوبت نہیں آئی ..

دوسرے اردو لغات جو سر سید نے لکھنی شروع کردی تھی ' اس کا
ہ موجود ھے جو آئندہ ھم اس رسالے میں پیش کریں گے - اس پر بعض
ین فاضلوں نے رائیں بھی لکھیں ..

یہ دونوں تجویزیں نہایت قابل قدر اور اردو زبان کے استحکام کے لیے لازم ہیں - سر سید کے صحیح ادبی ذوق اور دور بینی کا اسی ایک بات سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے ۶۶ برس پہلے اس چیز کا ڈول ڈالا تھا جس کی تکمیل پر ہم آج غور کر رہے ہیں —

سوسائٹی نے تقریباً چالیس علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں جن میں سے بعض کے نام جو ہمیں معلوم ہوے ہیں ذیل میں درج کیے جاتے ہیں —

۱ - تاریخ مصر قدیم مولفۂ رولن -

۲ - تاریخ یونان مولفۂ رولن —

۳ - رسالۂ علم فلاحت اسکاٹ برلن —

۴ - تاریخ چین بزبان فارسی قلمی ترجمۂ پادری ایکسوس —

۵ - تزک جہانگیری قلمی —

۶ - رسالہ علم انتظام مدن (پولیٹکل اکانمی) مولفۂ ولیم سینیر —

۷ - ایک گفتگو بر عہد لارڈ ڈلہوزی و لارڈ کیننگ مترجمۂ لفٹننٹ کرنل گریہم بزبان اردو —

۸ - تاریخ ہند مولفۂ الفنسٹن —

۹ - رسالۂ علم آلات مولفۂ تامسن —

۱۰ - رسالۂ علم طبیعات مولفۂ تامسن —

۱۱ - رسالۂ علم آب و ہوا مولفۂ تامسن —

۱۲ - رسالۂ برق مولفۂ ہیرس —

۱۳ - دیباچۂ تاریخ فیروز شاہی —

۱۴ - ٹاڈ ہنٹر کی کتاب اقلیدس مترجمۂ مولوی ذکاء اللہ -

۱۵ - جغرافیہ مولفۂ پادری ولکنسن —

۱۶ - سیاست مدن (مل کی پولیٹکل اکانمی کا انتخاب) مترجمۂ پنڈت دھرم نراین راے بہادر میر منشی اندور -

۱۷ - ترجمۂ علم مساحت مولفۂ ڈاکٹر ہنٹر —

۱۸ - ترجمۂ علم مثلث مولفۂ ڈاکٹر ہنٹر —

۱۹ - ترجمۂ الجبرا مبتدیوں کے لیے مولفۂ ڈاکٹر ہنٹر -

۲۰ - ترجمۂ نظریۂ مساوات مولفۂ ڈاکٹر ہنٹر -

۲۱ - گال بریتھہ اور ہاٹن کے سائنٹفک مینول یوکلڈ کا ترجمہ —

۲۲ - گال بریتھہ اور ہاٹن کے سائنٹفک الجبرا کا ترجمہ -

۲۳ - برنارڈ سمتھہ کی ارتھمیٹک کا ترجمہ —

۲۴ - برنارڈ سمتھہ کے الجبرا کا ترجمہ .

۲۵ - گال بریتھہ کی کتاب حساب کا ترجمہ -

۲۶ - ڈاکٹر ہنٹر کے الجبرا کا ترجمہ (کالجوں اور مدارس کے لیے) —

۲۷ - گال بریتھہ کی Plain علم مثلث —

۲۸ - ڈاکٹر ہنٹر کی Plain co-ordiate geometry —

۲۹ - ڈاکٹر ہنٹر کا (Integral Calculus) تکمیلی احصا —

۳۰ - ڈاکٹر ہنٹر کا (Differential Calculus) تفرقی احصا —

۳۱ - ترجمہ تاریخ ایران مولفۂ سر جان میلکم —

دہلی کالج اور اس کی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے بعد یہ دوسرا ادارہ تھا جس نے انگریزی سے مختلف علوم و فنون کے ترجمے اردو زبان میں شایع کیے - یہ کام جب آج کل دشوار نظر آتا ہے تو اس وقت کس قدر دشوار ہوگا جب نہ اچھے مترجم دستیاب ہوتے تھے اور نہ ان ترجموں

کی قدر کرنے والے کچھ زیادہ تعداد میں تھے - علاوہ اس کے عجائب خانے کے لیے سکے بھی جمع کیے - چنانچہ مسٹر تھارن ہل. جج سہارن پور اور مولوی فضل احمد تحصیلدار قائم گنج نے کچھ سکے بھیجے - ایک اشرفی عہد تغلق کی عنایت اللہ خاں صاحب رئیس بھکم پور نے دی —

سر سید کا قاعدہ تھا کہ وہ جس کام کا بیڑا اٹھاتے تھے ہاتھ دھوکے اس کے پیچھے پڑ جاتے تھے ' چنانچہ سوسائٹی کی بہبودی اور ترقی میں انھوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا - " ضلع کے رئیسوں کو اس کی امداد پر آمادہ کیا گورمنٹ کو اس کی طرف توجہ دلائی ' خود اپنی بساط سے بڑھ کر اس کو مالی امداد پہنچائی ' اس کی عالیشان عمارت اپنے اہتمام اور نگرانی میں بنوائی ' اس کی مستقل آمدنی کے لیے عمدہ عمدہ تدبیریں کیں ' لائق لائق آدمی ترجمے کے کام کے لیے مقرر کیے ' قریب چالیس کے چھوٹی بڑی علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں ' غازیپور ' علی گڑھ ' بنارس جہاں کہیں رہے سوسائٹی کے اخبار کو اپنے عمدہ مضامین سے برابر مدد پہنچاتے رہے یہاں تک کہ ہندوستان چھوڑنے کے بعد بھی سوسائٹی کی دھن میں برابر لگے رہے - چنانچہ ولایت جاتے ہوے جو خط کہ انھوں نے مولوی سید مہدی علی خاں کو عدن سے بھیجا تھا اس میں لکھتے ہیں کہ " مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کریں گے اور کوئی درجہ سعی کوشش کا واسطے شکست کردینے سوسائٹی کے باقی نہ رکھیں گے - پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اس کے سنبھالنے اور ممبروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمائیں " * —

* حیات جاوید حصہ دوم صفحہ ۳۶ - ۳۷ -

محض سوسائٹی کی خاطر کلکتہ کا سفر اختیار کیا اور ۶ اکتوبر سنہ ۱۸۸۳ ع کو مذاکرۂ علمیہ میں ایک طویل لکچر فارسی زبان میں سوسائٹی کے اغراض و مقاصد پر دیا —

اس سوسائٹی کے ذریعہ سے بعض تعلیمی تحریکیں بھی کی گئیں - مثلاً تحصیلی مکاتب کے نصاب تعلیم پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی - اسی سوسائٹی کے ضمنی نتائج میں سے ورنیکلر یونیورسٹی کی تحریک تھی جو اس زمانے کے لیے ایک عجیب خیال تھا - اس کا حال ہم آیندہ ایک علحدہ مضمون میں لکھیں گے —

اس سوسائٹی نے نہ صرف علمی اور تعلیمی خدمات انجام دیں بلکہ اس کی دیکھا دیکھی ملک کے مختلف مقامات میں متعدد انجمنیں اور سبھائیں قائم ہوگئیں جو اپنے حلقے میں مفید کام کرتی تھیں - سوسائٹی کے اخبار کا اردو اور دوسرے دیسی اخبارات پر بھی بہت اچھا اثر پڑا اور وہ سیاسی ' معاشرتی اور تعلیمی مسائل پر سنجیدگی سے بحث کرنے لگے - اس سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق کا اردو زبان اور ادب پر بڑا احسان ہے —

(اس مضموں کے لکھنے میں علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کی مختلف جلدوں ' گریہم کی لائف آف سید احمد خاں اور حیات جاوید سے مدد لی گئی ہے) —

شمالی ہند میں اُردو شاعری کی ابتدا و ترقی

از

شیخ چاند صاحب ایم - اے ، ایل ایل - بی

شمالی ہند میں اُردو شاعری کا باضابطہ آغاز دراصل بارھویں صدی ہجری کے اوائل میں ہوا ہے - اس میں شبہ نہیں کہ عالمگیر کے عہد کے پس و پیش ایسے شعرا گزرے ہیں جن کے اشعار تذکروں میں مل جاتے ہیں - چنانچہ موسوی خاں فطرت ، خواجہ عطا ، جعفر ، بیدل وغیرہ ایسے شاعر ہیں جن سے چند شعر منسوب ہیں - اُسی زمانے (۱۱۰۵ ھ) میں اسمعیل امروھی نے ایک مثنوی " تولد نامۂ بی بی فاطمہ " * لکھی ہے - اس کے سوا بعض شاعروں کا کلام بھی دستیاب ہوتا ہے لیکن یہ دراصل ایسی کوششیں تھیں جن کا مستقل اور پائدار اثر قائم نہ ہوسکا ، اور ان شعرا نے شمالی ہند میں اُردو شاعری کے رائج کرنے میں کوئی قابل لحاظ مدد نہیں دی - شمالی ہند اور خصوصاً دھلی میں اُردو شاعری کے آغاز کی تاریخ عالمگیر کا چوالیسواں سنہ جلوس (۱۱۱۲ ھ) ہے - یہ وہ تاریخ ہے جس میں بقول قایم ولی نے دھلی کا سفر کیا اور پہلی مرتبہ وہاں کے شاعروں کے حلقے میں اپنی ریختہ گوئی سے ہل چل ڈال دی -

---

* کتب خانۂ مولوی عبدالحق صاحب —

اور جب ۱۱۳۲ ھ میں بقول * حاتم ولی کا دیوان دہلی پہنچا تو موزوں طبع شاعروں کو متاثر و متحرک کردیا - یوں تو دکنی شاعروں کے کلام سے شمالی ہند کے شاعر اس سے قبل سے واقف تھے اور شمالی ہند کے بعض شاعروں کے کلام سے اس کی شہادت بھی ملتی ہے - قائم † (قائم چاند پوری سے قبل گزرا ہے) نے اپنے مرثیہ میں قادر کا ذکر اس طرح کیا ہے -

قائم کا آج ہند میں شہرا ہوا بلند دکھن میں اس کے شعر کہو قادر استیں

مخزن نکات (مولفہ ۱۱۶۸ ھ میں لکھا ہے کہ پچاس سال قبل مرزائے دکنی کے مرثیے ہاتوں ہاتھہ دکن سے شمالی ہند میں پہنچتے تھے اور عام طور سے پڑھے جاتے تھے لیکن ان کا کوئی بین اثر نہ پڑ سکا - یہ صرف ولی کے کلام کی کرامت تھی کہ اس نے شمالی ہند کے شاعروں کو ریختہ کی طرف متوجہ و مائل کردیا - اس کے مقلدین میں آبرو ' حاتم ' مضمون ' مظہر جان جاں ' احسن اللہ ' شاکر ناجی ' مصطفی خاں یکرنگ ایسے شعرا ہیں جو اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں - ولی کے تتبع میں طبع آزمائی کرنے کا ذکر ان میں سے بعض نے کیا ہے چنانچہ حاتم لکھتا ہے :-" در ریختہ ولی را استاد می داند ' - آبرو کا ایک شعر ہے : —

آبرو شعر ہے ترا اعجاز گو ولی کا سخن کرامت ہے

یہ شاعرانہ تعلی ہے ولی کا ذکر کرنا ہی اس کے اثر کو تسلیم کرنا ہے —

ولی کی تقلید سے اس کے مقلدین کے کلام میں ایک حد تک ہندی کا عنصر غالب تھا - اس ہندی عنصر نے اس قدر شدت اختیار کرلی تھی کہ ایہام کا رواج ہوگیا - ایہام کی بنیاد اسی عنصر پر قائم ہوئی -

---

* تذکرۂ مصحفی — † حمید نے قائم کو برھانپوری لکھا ہے جو دوسرا شاعر معلوم ہوتا ہے -

بقول آزاد " سنسکرت میں ایک لفظ کے کئی معنی ہیں اس واسطے اس میں برج بھاشا اور اُس کی شاخ میں ذو معنین الفاظ اور ایہام پر دوھروں کی بنیاد ہوتی تھی - فارسی میں یہ صنعت ہے مگر کم - اُردو میں پہلے پہل شعر کی بنا اسی پر رکھی گئی " - ظاہر ہے کہ ایہام کا التزام ایک مصنوعی اور غیر فطری فعل تھا جس نے عام شاعری اور خصوصاً غزل کو اثر اور سادگی کے جوہر سے محروم کردیا - اس میں مضامین کے ادا کرنے سے بڑھ کر ذو معنی الفاظ کے استعمال پر شاعر کی پوری قوت اور زور صرف ہوجاتا تھا، اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ کلام بے کیف اور بے لطف ہوجاتا تھا اور عام قبولیت حاصل کرنے سے محروم - اس دور کے اساتذہ کا کلام اٹھاکر دیکھیے تو شاعرانہ صناعی اور ہنر مندی پر حرف رکھنے کو جگہ نہیں لیکن سادگی اور اثر کافور ہیں، الفاظ کا ذخیرہ بافراط موجود ہے، اُن کے استعمال اور معانی کے مختلف پہلو روشن ہیں، عالم لسانیات اور محقق لغات کے لیے اُن کا کلام بیش بہا ذخیرہ ہے، لیکن کیف و لذت سے خالی ہے - اِبتداءً تو یہ طرز مقبول ہوئی لیکن بہت جلد یہ غیر فطری اِلتزام و تصنع مردود ٹھیرا - ایہام گوئی کے مشہور علم بردار حاتم کو بھی یہ روش چھوڑنی پڑی چنانچہ جب سنہ ۱۱۶۹ ھ میں اپنے کلام کا انتخاب " دیوان زادہ " کے نام سے کیا تو پرانی طرز کے کلام کو خارج کردیا اور لکھا ہے : —

کہتا ہے صاف و شستہ سخن بسکہ بے تلاش حاتم کو اس سبب نہیں اِیہام پر نگاہ

اِیہام گوئی کے خلاف تحریک کا آغاز در اصل اُن شعرا نے کیا جو ان ایہام گو اساتذہ کے بعد فوراً مجلس شاعری میں جلوہ افروز ہوے - اِن میں مظہر، سودا، میر، اور درد وغیرہ خصوصیت کے ساتھہ قابل

ذکر ہیں اِن کے دور میں قدیم روش شاعری یک قلم متروک ہوگئی - اس عہد کی ابتدا میں بھی ایک طبقہ ایسا موجود تھا جو اِیہام گوئی کا قائل تھا اور شاعری میں اس اِلتزام کو ملحوظ رکھنے پر مٹا ہوا تھا - میر کا شعر ہے :—

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے

کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

اِس سے صاف ظاہر ہے کہ اِن کے ابتدائی دور میں اِیہام کے ماننے والے موجود تھے اور اِس صنعت کو شعر کی دلچسپی اور لطف کا موجب سمجھتے تھے - اس دور کے بھی بعض شعرا نے اِس طرز میں طبع آزمائی کی ہے - سودا کی ایک غزل اِسی رنگ میں ہے لیکن اُس نے صاف کہہ دیا ہے کہ یہ ابتدائی دور کے اِیہام گو علم بردار مضمون اور 'آبرو' کی طرز ہے مجھے اس سے کوئی مناسبت نہیں :

اسلوب شعر کہنے کا تیرے نہیں ہے یہ مضمون و آبرو کا ہے سودا یہ سلسلہ

'آبرو' کی طرز میں ایک غزل لکھی ہے :

ہو شاد اِس غزل سے روح آبرو کی سودا

تو اس زمیں میں ناداں طور اپنا کیوں نہ بولے

میر حسن کا زمانہ کسی قدر بعد کا ہے' لیکن اس نے بھی اِیہام میں طبع آزمائی کی ہے' چنانچہ اپنے تذکرے میں اپنے چند شعر بطور نمونہ نقل کیے ہیں' جن کی نسبت لکھا ہے "چند اشعار بطور قدماے اِیہام بنداں گفتہ شد"- اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِیہام گوئی کا اثر کچھ نہ کچھ باقی تھا اور شاعر کم از کم بطور تفریح اِیہام میں طبع آزمائی کرتے تھے لیکن اِسی زمانے میں لوگ اِس سے بیزار ہوتے جاتے تھے جیسا

کہ سودا کے اوپر کے دو شعروں سے واضح ہے - یہی وجہ ہے کہ نوجوان شعرا کے حلقے میں یہ طرز مردود ٹھہری - اس کے غیر فطری ہونے پر نظر کر کے اُس کے خلاف شاعروں نے علم احتجاج بلند کیا - سودا نے صاف لکھا ہے :

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجکو دو رنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

اِیہام گوئی کی بے وقعتی میر صاحب کی رائے سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو انہوں نے احسن اللہ کے اشعار کے حق میں ان الفاظ میں صادر کی ہے " طبعش مائل بہ اِیہام بود ازیں جہت شعر او بے رتبہ ماند " -

مظہر ' سودا ' میر وغیرہ نے جب اس طرز کو چھوڑنا پسند نہیں کیا اور ایک نئی روش زیادہ وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھہ اختیار کی تو ان کو زیادہ دشواری اور دقت پیش نہیں آئی اس لیے کہ قدیم طرز سے عام بیزاری پھیل گئی تھی ' زبان بڑی حد تک بن چکی تھی ' الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود تھا ' زبان کے ابتدائی قواعد اساتذہ کے کلام سے مستنبط تھے ' فارسی عروض مدتوں پہلے اردو شاعری کا بنیادی عنصر بن چکا تھا ' نئے دور کے مذاق نے کئی الفاظ و محاورات کو متروکات میں داخل کر دیا تھا ' یہاں تک کہ کہنہ گو و مشاق بوڑھا استاد حاتم بھی اس اثر سے نہ بچ سکا - اسے بھی سنہ ۱۱۶۹ ھ میں " دیوان زادہ " نئی طرز میں مرتب کرنا پڑا - ولی کی استادی کا اثر جس کا خود اس نے اعتراف کیا ہے ' زبان و خیال کے اعتبار سے کم ہونے لگا اور رفتہ رفتہ قدیم زبان بڑی حد تک متروک اور ہند کی زبان میں طبع آزمائی شروع ہوگئی - حاتم نے لکھا ہے :

ہند کی گفتگو انوکھی ہے　　چرب ہے سب اوپر یہاں کی زبان

میر حسن نے بھی قدیم زبان کے ترک کرنے اور معانی و مضامین کی پیروی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ھے "چوں بنیادِ ریختہ از زبان دکن است بنا بریں صاحب سخنانِ ایں فن و معنی شناسانِ مغز سخن طرز زبانِ ھر دیار را معیوب نمی دانند و پیرویِ معانی می کنند" - قدیم زبان میں اصلاح کا حال دیوان زادۂ حاتم کے دیباچے سے واضح ھوتا ھے کہ کس طرح غیر مانوس ھندی عناصر کو خارج کرکے مروجہ زبان کے مطابق فارسی اجزا شامل کیے گئے :-

"لفظ 'در' و 'بر' و 'از' و 'واؤ' کہ فعل و حرف باشد در دیوان خود تقید دارد - دریں ولا از دہ دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ لسان عربی و زبان فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد و روز مرۂ دھلی کہ مرزایان ھند و فصیحان رند در محاورہ دارند، منظور داشتہ، سوائے آں زبان ھر دیار بہ ھندوی کہ آں را بھا کا گویند موقوف کردہ، محض روز مرہ کہ عام فہم و خاص پسند بود اختیار نمود ...... ایں قاعدہ (قاعدۂ متروکات) را تا کجا شرح دھد - غرض کہ خلاف محاورہ و غیر مصطلح و غلطی روز مرہ و نقصان فصاحت را دخل نہ باشد" -

حاتم کے اس بیان سے قدیم زبان میں اصلاح کا اندازہ ھوتا ھے اور صاف معلوم ھوتا ھے کہ ھندی عنصر کم ھوتا گیا اور فارسی عربی کے اجزا مستحکم ھوتے گئے - اس باب میں مظہر جان جاں نے اس قدر غلو کیا کہ اس زمانے میں ان کی اردو کو اھل فن نہ ریختہ کہتے تھے اور نہ فارسی بلکہ ان کی اردو کا حال بقول سودا "کتا دھوبی کا

کہ گھر کا نہ گھاٹ کا " تھا * —

یہیں سے فارسی اور ہندی کے عناصر میں اعتدال و توازن پیدا کرنے کی کوشش کا آغاز ہوا - اس سلسلے میں میر کے اس بیان پر نظر رکھنی چاہیے جس میں انہوں نے ریختہ کی اقسام کا ذکر کیا ہے اور آخر میں اس طرز کا ذکر کیا ہے جو اس دور میں رائج ہوئی - اس بیان سے یہ بھی واضح ہوجائے گا کہ ریختہ گوئی نے رفتہ رفتہ کیا صورت اختیار کی اور اس دور میں آکر اس کا کیا رنگ ہوا - یہ بیان چونکہ اس دور کے ایک مشہور استاد کا ہے اِس لیے ہر طرح لائق غور ہے ' میر صاحب نے لکھا ہے :—

" ریختہ کی چند قسمیں ہیں ...... پہلی یہ کہ ایک مصرعہ فارسی اور ایک ہندی ہو مثلاً قطعۂ امیر خسرو :—

زر گر پسرے چو ماہ پارا کچھہ گھڑیے سنواریے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست پھر کچھہ نہ گھڑا نہ کچھہ سنوارا

دوسری قسم یہ ہے کہ آدھا مصرعہ ہندی ہو اور آدھا فارسی جیسا کہ میر معز کا شعر ہے —

از زلف سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

تیسری قسم یہ ہے کہ فارسی کے حروف و افعال استعمال کیے جائیں - یہ قبیح ہے - چوتھی قسم یہ ہے کہ ایسی فارسی ترکیبیں لائی جائیں جو زبان ریختہ کے مناسب ہوں - یہ جائز ہے - لیکن اسے غیر شاعر نہیں جانتا ' ایسی ترکیبیں کہ جو ریختہ

---

* یہ غالباً مظہر کے ابتدائی کلام کے متعلق رائے ہے ورنہ ان کا بعد کا کلام بہت پاک صاف اور شستہ و رفتہ ہے —

کے لیے نا مانوس ہوں معیوب ہیں اور اس کا جاننا بھی سلیقۂ
شاعری پر موقوف ہے - میں نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے -
اگر فارسی ترکیب گفتگوے ریختہ کے موافق ہو تو مضائقہ نہیں -
پانچویں قسم ایہام کی ہے کہ اس فن میں جس کا رواج شاعرانِ
سلف میں تھا - اب طبائع اس صنعت میں کم مصروف ہیں
لیکن شستگی سے استعمال ہوتی ہے ' ایہام کے معنی یہ ہیں کہ
وہ لفظ ذو معنی ہو جس پر شعر کی بنیاد ہوتی ہے - ایک معنی
قریب ہوں اور دوسرے بعید - معنی بعید سے شاعر کی مراد
ہو اور قریب سے نہیں - چھٹی قسم وہ انداز شاعری ہے جسے
ہم نے اختیار کیا ہے ' یہ انداز تمام صنعتوں مثلاً تجنیس '
ترصیع ' تشبیہ ' صفاے گفتگو ' فصاحت بلاغت ' ادا بندی 'خیال'
وغیرہ پر محتوی ہے" —

ریختہ کی یہ تعریف و تحدید ممکن ہے کہ تحقیقی نقطۂ نظر سے
سے بالکل صحیح ثابت نہ ہو لیکن اس قدر تو یقینی ہے کہ اس دور کے
اساتذہ نے اردو شاعری کا انداز ہی بدل دیا اور اس میں وہ تمام
ضروریات اور لوازمات اختیار کرلیے جو شاعری کو سنوارنے اور بنانے
میں کام آتے ہیں - ان تمام التزامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی کا اثر
بہ شدت داخل ہو رہا تھا ' لیکن زبان کو غیر مانوس ترکیبوں اور لغات
سے پاک کرکے ہندی اور فارسی عناصر میں توازن و اعتدال بھی پیدا
کیا جا رہا تھا —

شمالی ہند میں جب اردو شاعری کا آغاز ہوا تو گنتی کے صرف چند
شاعر تھے ' ایہام گو بھی چند ہی تھے جس سے ظاہر ہے کہ اُردو شاعری ابھی

زیادہ مقبول نہیں ہوئی تھی' لیکن ایہام گوئی کے خلاف کوشش شروع ہوئی تو شاعروں کی تعداد میں ایک غیر معمولی اضافہ ہوگیا - اس کا ثبوت ان تذکروں سے آسانی سے مل جاتا ہے جو اس دور میں لکھے گئے ہیں - سنہ ۱۱۶۵ ھ میں میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں ایک سو چار شاعروں کا ذکر کیا ہے اور سنہ ۱۱۶۶ ھ میں گردیزی نے اتھانوے کا جن میں پچیس شاعر ایسے ہیں جو میر کے تذکرے میں شامل نہیں ہیں - سنہ ۱۱۸۸ ھ میں قدرت اللہ شوق نے دو سو اتھاسی شاعروں کا ذکر کیا ہے اور میر حسن نے قبل ۱۱۸۸ ھ ما بعد ۱۱۹۳ ھ دو سو اتھاسی کا - شورش نے سنہ ۱۱۹۳ ھ میں تین سو چودہ شاعروں کا تذکرہ لکھا ہے اس کے بعد شاعروں کی تعداد میں اس شدت سے اضافہ ہونے لگا کہ حصر و شمار آسان نہیں - اس تعداد اور تدریجی ترقی پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُردو شاعری نے تیس چالیس سال کے عرصے میں غیر معمولی مقبولیت اور ترقی حاصل کرلی - چنانچہ اس کا ثبوت ان مجلسوں کی کثرت سے بھی ملتا ہے جن میں ریختہ گو شاعر اپنا کلام سناتے تھے - فارسی گویوں کے لیے غزلوں کو منظر عام پر لانے کا ذریعہ مشاعرے تھے اس زمانے میں کئی جگہ مشاعرے ہوتے تھے - سب سے زیادہ مشہور سالانہ مشاعرہ مرزا بیدل کے عرس کے موقع پر ہوتا تھا - اس زمانے کے شاعروں کے کلام اور دیگر تحریروں سے اس کا حال معلوم ہوتا ہے * فارسی گویوں کے مشاعروں کے توڑ پر ریختہ گویوں نے مراختہ (صحبت ریختہ گویاں) کی بنا ڈالی تھی' چنانچہ مراختے کئی جگہ ہوتے تھے - مراختۂ خان آرزو' یہ ہر قمری مہینے کی پندرھویں تاریخ کو خان آرزو کے مکان پر منعقد ہوا کرتا تھا - حاکم لاہوری نے اپنے

* ملا حظہ ہو ہجو مولوی ندرت از سودا' رقعات انند رام مخلص —

تذکرہ " مردم دیدہ " میں اس کا ذکر کیا ھے ' مراختۂ خواجہ میر درد ' یہ بھی ہر مہینے کی پندرھویں کو درد کے مکان پر منعقد ہوتا تھا - معلوم ہوتا ھے کہ خان آرزو کے مراختے کا سلسلہ بند ہوا تو انہوں نے اپنے ھاں یہ صحبت گرم کی - کچھہ دنوں یہ سلسلہ جاری رھا - اس کے بعد درد نے یہ محفل اپنے ھاں رچانی بند کردی اور میر تقی میر سے کہا کہ ان کے ھاں مراختے منعقد ہوا کریں ' چنانچہ میر کے ھاں یہ صحبت گرم ہونے لگی - ان کے سوا میر نے اپنے تذکرے میں چند اور مراختوں کا ذکر کیا ھے - مراختۂ میر سجاد ' مراختۂ جعفر علی خاں زکی ' مراختۂ میر علی نقی وغیرہ - مشاعروں کی ترقی پذیر کثرت اور مجالس ریختہ کی ھنگامہ آرائی پر نظر کرکے ماننا پڑتا ھے کہ فارسی کا چراغ ٹمٹما رھا تھا اور ریختہ گوئی کا ھر طرف بازار گرم تھا —

گجرات کا باکمال شاعر اردشیر خبردار

از

(جناب اختر حسین صاحب رائے پوری)

دور حاضر کے گجراتی شاعروں میں اردشیر خبردار کا مرتبہ سب سے افضل اور بلند ہے - اس میں شک نہیں کہ اس امتیاز اور مقبولیت کی ایک بڑی وجہ اس کی قومی شاعری ہے اور وہ ستیاگرہ تحریک کا نہایت ہی نازک نگاہ ترجمان ہے - لیکن ہمارے خیال میں کوئی اصلاحی تحریک کسی آرتسٹ کے جذبات میں وہ گرمی نہیں پیدا کرسکتی جو اس کی تخئیل و قوت تخلیق کو تحریک دے سکے - اصلاح کا مقتضاء توازن ہے اور آرٹ کا منتہا خود فراموشی اور بے بسی - لہذا شاعری جب اس میدان میں قدم رکھتی ہے تو صرف بغاوت اور انقلاب کی ہمنوا ہو سکتی ہے - اصلاح اور توازن کے ساز پر اس کا نغمہ بے کیف اور بے نمک رہ جاتا ہے - اردشیر خبردار کی قومی شاعری میں وہ ولولہ اور جوش ہم نہیں پاتے جو اقبال اور نذرالاسلام کے ہاں بدرجۂ اتم موجود ہے - لیکن اسے چھوڑ کر خبردار کے پاس جو سرمایہ رہ جاتا ہے وہ ایسا ہے کہ صرف گجرات ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان اس پر بجا طور پر فخر کرسکتا ہے اور آج اس کا تعارف ہم کسی قومی شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ

ایک جمالیاتی آرتست کی حیثیت سے کرارہے ہیں —

ہندوستان میں عشقیہ شاعری نے دو مختلف راستے پکڑے - ایک ڈگر تو سنسکرت شاعروں کے لیے عام طور پر اور کالی داس کے لیے خاص طور پر مخصوص ہے - کالی داس فطری حسن کا دلدادہ تھا اپنے جذبات کو حسن و جمال کا آئینہ نہیں' بلکہ حسن فطرت اور مناظر قدرت کو اپنے محسوسات کا درپن بناتا تھا - ندی نالے اور جنگل پہاڑ اپنی اپنی بولیوں میں سرگوشیاں کررہے ہیں اور کالی داس بلا تکلف انہیں قلم بند کرتا چلتا ہے - یہ وہ زمانہ تھا جب روح اور مادے کی کش مکش میں دوگونیت پیدا نہ ہوئی تھی - بعد میں ویشنو اور بھکتی تحریکوں سے ویدانت' زوجانیت نوازی اور داخلیت کا اثر بڑھا اور شاعر نے مظاہرات کا آئینہ دار اپنی خودی کو بنایا - بذات خود قدرتی نظاروں میں کوئی کشش نہ رہی بلکہ شاعر کی ذہنی کیفیت پر ان کے نظاروں کا ردّ عمل کہیں زیادہ اہم قرار پایا - سنسکرت اور ہندی شاعری میں اس اختلاف نے بعدالمشرقین پیدا کردیا - ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کل کلاسک سنسکرت شاعری کا سب سے باکمال نمائندہ اردشیر خبردار ہے اور اس کی شاعری میں واردات عشق کے ظاہری و باطنی پہلوؤں کے امتزاج نے بڑی خوبی پیدا کردی ہے —

اردشیر خبردار کی زندگی ویسی ہی ہموار و یک رنگ رہی ہے جس کی توقع ہندوستان کے کسی متوسط طبقے کے فرد سے کی جا سکتی ہے - صوبۂ بمبئی کے شہر دمن میں نومبر سنہ ۱۸۸۱ ع میں وہ ایک نامور پارسی گھرانے میں پیدا ہوا - بیشتر آرتسٹوں کی طرح اسکول کی تعلیم اسے غیر دلچسپ معلوم ہوئی اور اوایل عمر میں ہی وہ مدرسے سے

علحدہ ہوکر نہج کے طور پر مطالعہ کرنے لگا - شاعری سے اسے ایک خاص شغف تھا اور ۱۶ سال کی عمر میں جب اس کے سو دوہے شایع ہوئے تو خرانٹ بوڑھوں نے عالمک میں سے اسے گھور کر سرہلایا اور اس کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کی - اس کے بعد سے اس کے کمالات اور شہرت میں برابر رقابت ہوتی آئی ہے - اس کی انگریزی نظموں کا مجموعہ (Silken Passel) انگلینڈ کے اہل نظر سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے اور دوسرا مجموعہ غالباً وہاں کی (Poetry Society) کی طرف سے شائع ہونے والا ہے - اس کی قومی نظمیں گجرات کے بچے بچے کی زبان پر ہیں اور گاندھی جی بھی فرصت کے اوقات میں انہیں دھیمے سروں میں گنگنایا کرتے ہیں! اس کی فلسفیانہ نظموں کا مجموعہ 'درشنکا' ذی ہوش لوگوں کے لیے سرمۂ بصیرت اور روح پرور بزرگوں کے لیے تفسیر حقیقت ہے - بہر حال اس کا نظریۂ زندگی صحیح ہو یا نہ ہو اس کی قادرالکلامی مسلّم الثبوت ہے —

لیکن فنا کا سرد چنگل ویدانت اور ستیاگرہ سب کے لیے ہے - ایک تخیل ہے جسے کبھی فنا نہیں اور آرتسٹ جب تخیل کے کاغذ پر حسن کی روشنائی اور عشق کے قلم سے انسانیت کے خدوخال بناتا ہے تو ابدیت اس کی تحریر پر دایمی شہرت کی مہر لگا دیتی ہے - اردشیر خبردار کی وہ نظمیں ہمیشہ شوق سے پڑھی جائیں گی جن میں وہ اپنے مخصوص انداز میں حسن کی شوخی اور عشق کی وارفتگی کی تصویر کھینچتا ہے -

یہ سچ ہے کہ اردشیر خبردار کا تغزل یاس و حرماں کے ان جذبات سے نا آشنا ہے جو اردو شاعری کا ایک خاص عنصر ہے' لیکن غور سے دیکھا جائے تو تمام ہند و ادب اس حزنیہ (ٹریجک) رنگ سے خالی ہے جو آرٹ

کی جان ہے - اور اسی وجہ سے ہندو شاعری کی معشوقہ ایک ایسی عورت ہے جس کا ملنا اگر آسان نہیں تو دشوار بھی نہیں ہے - محرومی کی اذیت کو ہندو شاعر نہیں سمجھہ سکتا اس وجہ سے کہ جنسی معاملات میں ہندو سوسائیٹی میں ایسے بدنصیب کم ہوتے تھے جو محروم و ناکام رہ جائیں —

لیکن طرب و نشاط کی یہ وارفتگی ملاحظہ ہو کہ ہر لفظ شراب میں ڈوبا ہوا ہے اور ہر بند شاعر کی شادمانی کے ساتھہ رقصاں و خنداں ہے - روح (Soul) اور حس (Sense) کا اتحاد کیا کسی معمولی صناع کی کاریگری ہوسکتی ہے کہ جب 'اردشیر' اپنی محبوبہ کی رفتار کا بیان کرتا ہے تو الفاظ گھنگھرو بجانے لگتے ہیں اور جب اس کی گفتار کا ذکر کرتا ہے تو بندشیں اتنی سست و سبک ہو جاتی ہیں گویا پھول جھڑ رہے ہیں گو اس کے جذبات میں وہ تنوع اور ندرت نہیں جو ٹیگور کی امتیازی شان ہے لیکن معنی آفرینی' جدت تخیل اور رنگینیِ بیان میں وہ اپنے ہم عصر سے آگے بڑھ جاتا ہے —

زمانۂ حال میں جب زندگی کی ہنگامہ پروری اور حرفت کی ستم رانی نے آرٹ کو پسپا کر رکھا ہے اور وہ دن دور معلوم ہوتا ہے جب وہ از سر نو تازہ دم ہو سکے گا تو یہ ملک کم از کم اس اعتبار سے دنیا کے تمام ممالک پر ضرور فوقیت رکھتا ہے کہ آج ایسے بلند مرتبہ شاعر کسی ایک ملک میں موجود نہیں ہیں - اردشیر خبردار انہیں معدودے چند شاعروں میں سے ایک ہے —

یہاں ہم اس کی شاعری کے چند نمونے پیش کرتے ہیں - ترجمے میں شاعر کے جذبات کو صحیح طور سے ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے —

محبت کا گیت

جہاں زرِ گل کے فوارے صبح و مسا چلا کرتے ہیں اور اپنے
ستارہ جبیں قطروں کو ہر طرف بکھیر دیتے ہیں —

جہاں دوشیزۂ صبح خوابوں کے تانے بانے سے نور کے تار نکالتی ہے،
جہاں گلناری پردوں کے جھلملاتے ہوے سایے تل کی طرح سمٹ جاتے ہیں
اور مستانہ ہوائیں محو خرام رہتی ہیں —

جہاں دوج کے چاند کی ملگجی کرنیں غش کھا کر صبح تاباں کے
آغوش میں گر پڑتی ہیں —

وہیں، میں ہری ہری دوب پر ناچتی ہوئی دنیا والوں کو اپنے
گیت سناتی ہوں —

جب آفرینش کا سوتا سوکھا ہوا تھا اور دنیا کی بساط ایک بے روح
ہیولی سے زیادہ نہ تھی —

جب ہر ذرہ اس شعلے کے انتظار میں دم بخود تھا جس کی لپک
جان جہاں بن جاے گی —

جب 'زمانہ' اپنی آنکھوں اور کانوں کو بازوؤں سے ڈھک کر خاموش
و مبہوت بیٹھا ہوا تھا —

اور حقیقت خوابیدہ اس نور کی تلاش میں حیران تھی جو مدتوں
پہلے اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی —

تو — میں نے ایک رسیلا نغمہ چھیڑا اور اے لو، انھیں میرے ہر ہر
نقش قدم پر ایک ایک عالم کروٹ لیتا نظر آیا —

میری بنسی کی ہر تان ایک چنگاری تھی جس نے رات کے دیپکوں
میں جوت جگا دی —

اور سنہرے پرندوں کی طرح، مہر و ماہ نے میری مسرت کی نورانی

مالاؤں میں گوندھ کر دنیا کے گلے میں پہنا دی —

میری نواسنجی کے سانچے میں خلد بریں کا کالبد ڈھلا اور وہاں کے برگ و شجر نے غیر فانی انبساط کا لباس اوڑھ لیا —

اور 'وقت' موسیقار کی طرح آپ اپنی خاکستر سے اٹھا کہ میرے مندر کی آرتی کرے —

اور میرے سرگم کی سیڑھیوں پر چڑھ کر 'حقیقت' میرے حضور میں سجدہ ریز ہوگئی —

میرا ہر تار نفس بہار کی دلربائیوں کے ساتھ غزل خواں ہے - میں بادلوں کے جھولے پر جھولتی ہوں' وہ میرے اشاروں پر رقص کرتے ہیں-

اور میں برشگال کی ہلکی ہلکی پھوار کے ساتھ ناچتی ہوں - کبھی زمستاں کی سرد پتیوں کے ساتھ میں خاک بسر رہتی ہوں —

اور کبھی باد سموم کی ہم رکاب ہو جاتی ہوں —

کبھی برف کے ٹکڑوں کے ساتھ زمین پر پھسلنے لگتی ہوں —

کبھی میں دن کی روشنی کے ساتھ آتی ہوں اور کبھی رات کے ساتھ — وہ رات جو سپنا پوری کی ملکہ ہے —

تیرا تبسم

تیری مسکراہٹ بھالے کی وہ انی ہے جو فولاد کے دل و جگر میں بھی سوراخ ڈال دیتی ہے --

وہ دھوپ چھانو کی پرچھائیں ہے جو ندی کے سبک رفتار دھارے کو آئینہ دکھاتی ہے --

تیرا تبسم گلاب کا وہ پھول ہے جس کی پنکھڑیاں برف پر بکھر گئی ہوں -

جان من! تجھے کیا خبر کہ تیری کرشمہ گری نے 'تبسم' کا پیرایۂ

اظہار اختیار کرلیا ہے —

ایک جنبش لب ؟ — اور میرے خیالات کا سارا شیرازہ منتشر ہوگیا —

ایک لرزۂ تبسم ؟ — میں اس کا اتنا ہی رسیا ہوں جتنا سردیوں میں سورج کی ایک کرن کا —

ہلکی سی مسکراہٹ ؟ — اور میرا دل آپ اپنی خود فریبیوں کے دام کا اسیر ہوگیا —

جان من ! اس شمع کی لو کو زیادہ نہ اُکسا ورنہ کس کا دیدہ ہے جو خیرہ نہ ہوجائے —

گرمیوں کی کوئی صبح تیری مسکراہٹ کی دل‌کشی کو نہ پاسکی سردیوں کی چاندنی کو لجاجت کا یہ انداز کب میسر ہے ؟ شفق شام یا آیا کسی گل خنداں میں یہ بانک پن نہ آیا — نہ آیا —

حسن و جمال کا کوئی مجسمہ قوس قزح کی رنگینیوں کو ہونٹوں میں گھلا کر یوں فضا میں نہیں بکھیر سکتا —

تیرے تبسم کی ضیا طرازی میں میری چمک جگنو کی طرح ماند پڑرہی ہے —

للہ ! ان ہونٹوں اور آنکھوں کو دوسری طرف پھیر لے جنکی ہر جنبش کے ساتھہ جنت کے چراغ جلتے اور بجھتے ہیں —

تیرا تبسم میری دنیا میں ہنگامہ برپا کر دیتا ہے اور پھر اس کے بغیر ہر طرف سناٹا ہوتا ہے — سناٹا اور اندھیرا ! —

اگر اس دنیا میں کوئی بہشت بن سکتی ہے تو اس کی تخلیق تیرے ہی تبسم سے ہوگی ! میرے سرو ناز ' ایک مرتبہ اسی انداز سے مسکرا دے —

(۱) نظارہ

واردات محبت | کف دریا کی طرح سبک اور سفید پھولوں کی سیج سے —
خواب ناز سے میری محبوبہ یوں بیدار ہوئی گویا گل صنوبر کی ایک چھڑی لچک کر ٹہنی سے گر پڑی ہو۔

گویا سپنا پوری سے کوئی دیوی اس دنیا میں اتر آئی ہو۔ یا لیلائے شب کی گود میں بنت نور مچل اٹھی ہو اور اس کی جلوہ گستری نے زمین و آسمان کو شاداں و فرحاں کردیا ہو —

رات سے کہو کہ بھول جائے اپنے تمتماتے ہوئے ستاروں کو اور صبح سے کہو کہ بھول جائے اپنے شبنمی اجالے کو۔

سمندر سے پوچھو کہ کیوں یاد کرتا ہے اپنی بیکرانی کو، اور بہار سے پوچھو کہ کیوں یاد کرتی ہے اپنی چمن آرائی کو، نہیں بھول سکتا کیا یہ پھول اپنی نازک ادائی کو، اور کب تک روئےگی زمین ان نونہالوں کو جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پیوند خاک ہوگئے —

اگر وہ بھول سکتے ہیں تو سب کچھہ بھول جائیں کیونکہ دیدار محبوب کے بعد شاعر اپنے گیتوں کو بھی بھول رہا ہے —

دل نواز! یہ جو صدائے نغمہ فضا میں گونج رہی ہے —

دراصل ان لہروں کی صدائے بازگشت ہے جو تیری روح کے وسیع سمندر میں اٹکھیلیاں کیا کرتی ہیں۔

ان موتیوں کی چمک میں جو تیرے دل کی گہرائیوں میں سامان نظارہ مہیا کر رہے ہیں۔

(۲) حسن

کلی کے لوچ سے پھل رنگ و بو حاصل کرتا ہے اور سیلاب اشک میں مسکراہٹ کی سیپی اجاگر ہوتی ہے - رات کی گہری تاریکی میں دنیا ابدیت کے خواب دیکھتی ہے اور قدرت کے ارتقا میں انسان کی قوت پروان چڑھتی ہے - زندگی موت کے رتھہ پر بیٹھہ کر جہاں گشتی کرتی ہے اور کانٹوں کے آغوش میں پھول یوں کھلتا ہے جیسے رشک کے آغوش میں عشق!

اور جس طرح نور عالم سمٹ کر آفتاب میں سما جاتا ہے اسی طرح حسن کے سارے تار میری محبوبہ کے رباب میں اکٹھا ہوجاتے ہیں —

دیکھا ہے کبھی راج ہنس کو تم نے مان سرور میں تیرتے ہوے دیکھا ہے کبھی قطرہ کو گہر ہوتے ہوے؟ برف کو پگھلتے ہوے؟ اور یا تم نے گوگل کی پتی کی نزاکت کو غور سے دیکھا ہے؟ کسی تیتری کے پر کبھی تمھارے ہاتھوں پر تھرتھراے ہیں؟ شاعری کے ابدی ترانوں کی گونج کبھی روح کے ساز پر سنی ہے؟ —

خواب میں کوئی پری کبھی تمھیں کوہ قاف اتھا لے گئی ہے؟ اگر ایسا ہوا ہے — تو تم میری محبوبہ کی نزاکت، ملاحت اور لطافت کا اندازہ لگا سکتے ہو — جو آب حیات سے زیادہ لطیف، کنول سے زیادہ ملیح، اور چھوئی موئی سے زیادہ نازک ہے - میری محبوبہ جاڑوں کی چاندنی کی طرح سیمیں اور چودھویں کے چاند کی طرح خنداں و فرحاں ہے -

وہ امرت کے لب ریز پیالے کی طرح جوانی کے رس میں شرابور ہے کاش میں وہ ساغر ہوتا جس میں یہ شراب شباب ڈھالی گئی ہے تو میں اسے اپنی رگوں میں اس طرح حلول کر لیتا کہ ایک قطرہ بھی چھلک کر نہ گر سکتا -

(۳) نشاط

سلونا نکھار کے بعد میری محبوبہ گل شگفتہ کی طرح آغوش کشودہ ہو جاتی ہے -

دور سے میرے نین حریص بھونرے کی طرح اس کے رس کو چکھنے کے لیے ابروؤں کے پر تولنے لگتے ہیں -

پھر میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنی ملتجی آنکھوں کی ڈور سے پتنگ کی طرح اسے اپنی طرف کھینچ لوں -

لیکن یہ دیکھو وہ نہیں پڑی — اور چشم زدن میں ڈور کٹ گئی اور پتنگ پھر ہوا میں اڑنے لگی -

اپنی سہیلیوں کے ساتھہ وہ تالاب میں جل کلیل کرتی اور تھک کر کنارے پر بیٹھہ جاتی ہے -

جب وہ جوڑا کھول کر پانی میں اپنے پانؤ لٹکا دیتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ عروس شام نے مشرق کی ساری رنگینیاں چرالی ہیں -

اور جب وہ اپنے گلے میں کنول کے ڈنٹھلوں کی مالا ڈال لیتی ہے تو گمان ہوتا ہے کہ سنگ مرمر کے ایک بت پر کیوپڈ نقش و نگار بنا رہا ہے -

جب وہ پانی میں منہ دیکھتی ہے تو گویا چاند فرش آب پر کنول کے جھولے میں جھولنے لگتا ہے -

سورج کو اس لیے پوجتا ہوں کہ اس میں عظمت ہے اور آگ کو اس لیے کہ اس میں روشنی ہے —

چاند کو اس لیے پوجتا ہوں کہ اس میں حسن ہے اور دریا کو اس لیے کہ وہ غیر فانی ہے —

بادل کو اس لیے پوجتا ہوں کہ وہ کبھی گرجتا ہے ' کبھی برستا ہے

اور کبھی کھل جاتا ھے —

اور ھوا کو اس لئے کہ وہ کبھی آندھی بن جاتی ھے اور کبھی نسیم و شمیم —

کیوں نہ ان دیوتاؤں کو چھوڑ کر ایک اپنی محبوبہ کی پرستش کروں جس میں یہ سب صفات موجود ھیں —

وہ سورج بننا چاھے تو واللہ میں آسمان بن جاؤں —

اور وہ بجلی بنے تو میں بادل بن جاؤں —

وہ کویل بنے تو میں آم کی ڈال بن جاؤں اور وہ مرلی ھونا چاھے تو میں 'کشن' بن کر اسے ھونٹوں سے لگا لوں —

وہ سمندر بنے تو میں ساحل ھو جاؤں —

اور وہ پھول بنے تو میں بھونرا بن کر ھمیشہ اس کے کانوں میں سر گوشیاں کروں —

الٰہی! مجھے حیات دارین عطا کر کہ میری محبت کا چراغ ھمیشہ روشن رھے —

وہ دیکھو، وہ جان جاں، وہ بند حیات، وہ دل کی کلی ادھر آرھی ھے - میرے پاس ھزار جانیں ھوتیں تو سب کو اس کی ایک لغزش مستانہ پر نثار کر دیتا —

وہ آرھی ھے — ایک سر جوش لہر کی طرح جو میرے دل سے ایک میٹھے راگ کی طرح ٹکرا جاتی ھے —

میں ایک بت سنگیں تھا جسے اس کی ایک ٹھوکر نے 'اھلیا' کی طرح زندہ کر دیا —

اعجاز مسیحا پر کیوں نہ ایماں لاؤں کہ خود بھی تو ایک فسوں طراز کا جلایا ھوا ھوں —

(۴) پوجا

نہ آفتاب تھا اور نہ ماہ تاب --- ایک تیرا ہی جلوہ تھا —

نہ سمندر تھا اور نہ ساحل --- زمین سے آسمان تک تیرے سوا کچھ نہ تھا ۔

نہ جنون تھا نہ عقل --- فہم و وہم سب تیرے کرشمے تھے -

نہ پرواز تھی نہ رفعت --- فضا تیری تھی' صبا تیری تھی —

نہ تو آسمان میں تھی اور نہ زمین میں - تو محبت کے زن کھٹولے پر بیٹھ کر ایتھر کی چادروں میں لہراتی رہتی تھی —

---

(۵) بے بسی

عشق کا بندہ ہوتے ہوئے بھی یہ کہنے کی جرات نہیں ہوتی کہ میں اس کی حقیقت کو پا گیا ۔

اس کی ایک آنکھ تبسم بہ کنار اور دوسری اشک بار ہے - اس کے ایک ہاتھ میں روشنی اور دوسرے میں تاریکی ہے —

وہ آگ سے زیادہ گرم اور برف سے زیادہ سرد ہے - وہ زندگی' خواب اور موت کا حسین ترین امتزاج ہے - اس کا سر بہشت بریں میں ہے تو پانو تحت الثریٰ میں —

مجھے یہ کہنا چاہیے کہ میں محبت سے ناواقف ہوں لیکن اس کی عینک سے تجھے پہچان گیا ہوں —

کبھی کبھی میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آتا ہے اور میں سوچتا رہ جاتا ہوں کہ حدیث عشق کی تفسیر یہی تو نہیں ہے —

وہ ہمارے آنسو ہیں جو آسمان پر جم کر ستارے بن گئے ہیں —

جان من' زمین آسمان کی دی ہوئی بارش کے معاوضے میں کیوں

نہ ہمارے آنسوؤں کی جھڑی کا منہ اوپر کی طرف پھیر دے اور ان کے ساتھ اوپر چڑھ کر میری روح جنت کی رنگینیوں میں تحلیل ہو جائے —

آفتاب صبح اس لیے طلوع ہوتا ہے کہ شام کو غروب ہو جائے —

لیکن محبت کا آتش کدہ ایک مرتبہ بھڑک کر کبھی نہیں بجھتا -

ستاروں کے پھول اس لیے کھلتے ہیں کہ مرجھا جائیں لیکن آسمان کا گل کدہ سدا بہار ہے —

جب مہ و انجم نوامحروم سروں میں بہاگ گاتے ہیں تو او خدائے محبت! میں سمجھہ جاتا ہوں کہ درد کی انتہا یہ ہے کہ دوا ہو جائے —

---

(۶) ہوش

ایک مرتبہ میری کشتی بھنور میں پڑ گئی ' اس کے مستول اور بادبان ٹوٹ کر پانی میں گر گئے اور لنگر بھی بہہ گیا —

کسی گم دیدہ مسافر کی طرح گمراہ ہو کر یہ ناؤ منجدھار میں یوں حیراں و غلطاں چکر کاٹ رہی ہے کہ سمت و ساحل دور سے اسے دیکھہ کر ہنس رہے ہیں -

اور اسی خستہ حالی میں کیا دیکھتا ہوں کہ افق پر سورج ندی سے نہا کر نکلا اور ایک سنہری کشتی بام فلک پر ہویدا ہوئی —

نہنگ آسا موجوں میں پھنس کر میری ننھی سی ناؤ تنکے کی طرح کبھی ڈوبتی ہے ' کبھی ابھرتی ہے -- کیا معلوم کہ ناخدا میری خبر لے گا یا نہیں —

آج جو میری محبوبہ اُداس ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اپنے ریاکار بندوں کا سوگ لیا ہے —

اس کے ہونٹوں پر تبسم بے جان ہو کر تڑپ رہا ہے اور یہ محسوس

ہوتا ہے کہ آسمان پر بادل گھر تو آئے ہیں لیکن نہ وہ برستے ہیں اور نہ کھلتے ہیں — نہ ان میں بجلی تڑپتی ہے —

آہ، مجھہ غمزدہ کی جات سونی ہو رہی ہے میری بے نور آنکھوں کا کاجل دھل رہا ہے —

میں نے کائنات کا ہر ذرہ چھان مارا لیکن میری مایۂ حیات کہیں نہ ملی —

میں ازل اور ابد کے سروں کو دیکھ آیا - اور تحت الثری کی عمیق گہرائیوں تک پہنچ گیا - آفتاب کی آتشیں زلفوں کو کمند بنا کر میں اس غار میں اترا جہاں تاریکی اور تنہائی دو بہنیں رہتی ہیں -

لیکن وہ مشام جاں کہیں نہ ملی اور میرے گیتوں کے تینے ٹوٹ کر ہوا میں منتشر ہو گئے —

---

(۷) کامرانی

او مرغ خوش الحان، تو ہمیشہ سر بلند پہاڑیوں کی سیر کرتا رہا ہے - اب نیچے اتر اور وادیوں کو بھی اپنے نغموں سے زمزمہ ریز کر دے - تو ہمیشہ عظمت و رفعت کا جویا رہا ہے —

آ، اور میدان کی وسعت کو بھی ایک نظر دیکھہ جا —

ان بدلیوں میں پانی ہے تو ان برساتی ندیوں کی اٹھتی جوانی بھی کچھہ کم تسکین بخش نہیں —

آ، میرے نغمہ گر اور اپنے میٹھے بولوں سے ان میدانوں میں امرت کی دھار بہا دے —

درد نا آشنا ساحل کو منانے کے لیے سمندر روز اس کی خدمت میں جل پریوں کے غول بھیجا کرتا ہے —

وہ کبھی ہلکے سروں میں گاتی ہیں، کبھی آنسوؤں سے اس کے پیر دھوتی ہیں، کبھی اس کی سنگ دلی پر کھج کر چیخ اٹھتی ہیں —

یہ ساحل کبھی نہ پسیجیگا — اور ایک دن وہ آئے گا کہ مدوجزر کا طوفان اس کے بند بند توڑ دیگا —

پیاری، اسی طرح دریاے محبت میں طوفان اٹھنے والا ہے جو تجھے اپنے آغوش میں ہمیشہ کے لیے چھپا لے گا —

محبت کے ڈینوں پر بیٹھہ کر میں اندھیرے میں اڑا کرتا ہوں - میں صرف ایک گیت گاتا ہوں، میرے ساز میں صرف ایک راگ ہے، ایک تان ہے، ایک سر ہے —

میں صرف ایک خواب دیکھتا ہوں —

میں نے سب دیوتاؤں کے مندر توڑ کر ایک مندر کھڑا کیا ہے جس کا نام ہے — پریم مندر —

میرے لیے سارے الفاظ کے معنی صرف ایک لفظ میں سمٹ آئے ہیں - پریم -

---

الوداع

میرے گیت، جا اور آسمان پر وہ ساز چھیڑ کہ ستارے ٹوٹ کر گر پڑیں اور تیری ایک ایک تان اس کی جگہ لے لے، حتیٰ کہ تو سارے فلک پر چھا جاے - اب تک تو نازک پودوں کی لچک دار ٹہنیوں پر نوا ریز رہا اور یا میری جھوپڑی میں بیٹھہ کر نوحہ خوانی کرتا رہا —

اب جا اور اس آسمانی ملک کو اپنی سحر نوائی سے مدھوش کر دے جو گوش بر آواز تیرا، منتظر ہے —

بادۂ کہن

غزلیات اشرف

اشرف، ولی کے معاصرین میں خاص درجہ رکھتا ہے - ولی اور اس کے معاصرین نے اپنے کلام میں اس کا ذکر کیا ہے - ولی کا شعر ہے :-

اشرف کا یو مصراع ولی مجکوں ہے دلچسپ
الفت ہے دل وجاں کوں میرے پیم نگرسوں

اشرف نے بھی ولی کا ذکر کیا ہے —

کرتا ہے یو مصراع ولی صید دل اشرف
پھر مری خبر لینے وو صیاد نہ آیا

ان اشعار سے اشرف کا معاصر ولی ہونا ثابت ہے - ایک اور ثبوت ان کی معاصرت کا ہے ولی نے اپنے کلام میں سیدابوالمعالی نامی سید زادے کا ذکر کیا ہے اور بقول قایم اس کے ساتھ ۱۱۱۲ ھ میں دھلی کا سفر بھی کیا تھا - قایم لکھتا ہے —

" درسنہ چھل و چھار از جلوس عالم گیر ھمراہ سید ابوالمعالی نام سید، پسرے کہ دلش فریفتۂ او بود بشاہ جہاں آباد آمد " —

اشرف نے بھی سید معالی کے حسن و جمال کی تعریف میں ایک پوری غزل لکھی ہے اور متفرق اشعار میں اس کا ذکر کیا ہے ۔ اس کا ایک شعر ہے —

معالی حسن میں سب سوں بڑا ہے　اسے دیکھن کوں کئی عالم کھڑا ہے

شفیق نے اشرف کو معاصرِ ولی لکھا ہے لیکن حمید اورنگ آبادی نے اس کو "بلا واسطہ شاگرد ولی" لکھا ہے - حمید کا مدعا غالباً یہ ہے کہ اشرف باضابطہ شاگردِ ولی تو نہ تھا لیکن اس کے کلام سے فیض اٹھایا ہے - شاید ایسا ہو - لیکن اب تک نہ تو کسی تحریر سے یا خود اشرف یا ولی کے کلام سے ان کے استاد و شاگرد ہونے کا ثبوت ملتا ہے - بہر حال معاصرت مسلم ہے - ولی نے ۱۱۱۹ھ میں انتقال کیا ہے لیکن اشرف فرخ سیر کے زمانے تک زندہ رہا - سید معالی کی تعریف میں اس کا ایک شعر ہے جس میں فرخ سیر کا ذکر استعارتاً کیا ہے —

جگت کے خوبرو سارے نہ ہوئیں کیوں حکم میں اس کے
دیار حسن میں فرخ سیر سید معالی ہے

حمید نے اشرف کو گجراتی لکھا ہے لیکن اس بیان کے سوا کوئی اور شہادت یا سند اس کے گجراتی ہونے کی نہیں ملتی ہے البتہ اس نے اپنے کلام میں گجرات کے بزرگ شاہ عالم کا ذکر کیا ہے اور ان سے عقیدت ظاہر کی ہے —

پھر اشرف کے شاہ عالم ہیں　خلف الصدق سید اقطاب
مجھ سے عاصی کوں کئیں نہیں ہے پناہ　مگر ان کی جناب فیض مآب

یہ عجیب بات ہے کہ جس طرح ولی نے اپنے آپ کو "شاعر ملک دکن" لکھا ہے اس طرح اشرف نے گجرات کا ذکر نہیں کیا بلکہ اپنے شعر کی داد شاعرانِ دکن سے طلب کی ہے - حمید کے تذکرے میں اس کی غزل ہے جس کا مقطع ہے —

یہ شعر سن کے کہے ہیں صد آفریں اشرف
تمام شاعر ملک دکن ' سخن کی قسم

اشرف کے حالات ابھی تک روشنی میں نہیں آے ہیں - حمید نے اس

کا نام محمد اشرف لکھا ہے لیکن انجمن ترقیٔ اردو کے کتاب خانے میں اس کا جو دیوان ۱۱۲۹ھ میں محمد بدیع الزماں کا لکھا ہوا ہے اس میں اس کا نام جگہ جگہ "اشرف الموسوی المدنی الشاھی" تحریر ہوا ہے - یہ دیوان انجمن کو سورت میں دستیاب ہوا ہے - سنی المذہب تھا - اس لیے کہ شاہ عالم گجراتی سے عقیدت رکھتا تھا اس کے سوا اس کا ایک شعر ہے —

اخلاص سوں نظر کر اے صاحب بصیرت
ہر چار یار حضرت تمثیل چار قل ہے

شہیدان کربلا اور اہل بیت سے بھی خاص محبت رکھتا تھا - اس نے کئی مرثیے لکھے ہیں چند اس کے دیوان میں بھی ہیں - اس کے دیوان کے حاشیے پر رضی' صالح اور فراقی کی غزلیں ہیں - فراقی کا ذکر ولی نے اپنے اشعار میں کیا ہے - اشرف نے رضی کا ذکر کیا ہے - اس کے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں جن میں رضی کا ذکر ہے —

اس مصرع رضی کا اشرف ہے دل سوں بھو کا
بے غم ہمارے غم کوں کہاتا نہیں سبب کیا

یاد کر اشرف یو مصراع رضی مصحف گل کا سبق بابل پڑے

حمید نے رضی کو معاصرِ اشرف اور شاگردِ ولی بتایا ہے - رضی' ولی کا شاگرد ہو یا نہو لیکن معاصر اشرف تو ضرور تھا اور اس طرح فراقی اور صالح بھی اس کے ہم عصر تھے —

اشرف کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پختہ گو شاعر تھا - کلام کا عام رنگ بھی وہی ہے جو ولی کے کلام کا ہے - اپنے زمانے میں اس کو اچھی خاصی شہرت حاصل تھی - حمید نے لکھا ہے —

طبع رنگیلے داشت - شعرش در نواح گجرات شہرت دارد و

دیوان لطیف تصنیف نمودہ " —

اشرف کے کلام کی ایک خصوصیت کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو ولی کے کلام میں بھی نمایاں ہے - ولی نے اپنے اشعار میں امرت لال ' گوبند لال' محمد یار خاں ' سید ابوالمعالی کے حسن و جمال کی بڑی تعریف کی ہے - اس طرح اشرف نے بھی عظمت اللہ ' ظفر خاں اور سید معالی کے حسن کی تعریف کی ہے ' سید معالی کی تعریف کا اوپر ذکر ہو چکا ہے - دو علحدہ غزلوں میں عظمت اللہ اور ظفر خاں کی تعریف لکھی ہے یہاں ایک ایک دو دو شعر نقل کیے جاتے ہیں —

عظمت اللہ بسکہ ہے پیارا　　جیو اپس کا میں اس اُپر وارا

ظفر خاں گلشن ناز و ادا　　بلبل دل اس اُپر ہے مبتلا
گرچہ ہے افغاں پسر و نازنیں　　ہے ادا اس کی ادائے میرزا

انجمن کے نسخے سے اشرف کی چند غزلیں نقل کی جاتی ہیں جن سے اس کی شاعری کا انداز معلوم ہوگا - (چ)

جب سجن مکھہ اُپر نقاب کیا　　چشم عاشق کوں جوں سحاب کیا
جو پیا ہے پیا کے لب کی شراب　　نقل خاطر جگر کباب کیا
آشنا اس کے بحر حسن ستی　　میں اپس دل کوں جیوں حباب کیا
تب سیں ہوں غرق بحر درد و الم　　جب سیں اس شوخ نے عتاب کیا
تجھہ جدائی میں چشم اشرف سوں　　جوش دریاے خون ناب کیا

قد موزوں نے اس کے کام کیا　　سرو رعنا کوں پاے نام کیا

پاے تا سر ہے بسکہ صورت ناز کس ادا سوں دیکھو سلام کیا

ساغر مست چشم ساقی سوں نشاء عشق میں مدام کیا

خضر وقت اس کوں بولنا ہے بجا جس سوں امرت بچن کلام کیا

مشرق مکھہ پہ کھول زلفاں کوں صبح کے بیچ وقت شام کیا

نیم بسمل تھا تیغ ناز ستی نگہ شوق نے تمام کیا

تب سوں ہے سرو باغ میں پابند جب سوں وو سرو قد خرام کیا

تجھہ جدائی میں خواب راحت کوں میں ایس کے اُپر حرام کیا

بسکہ اشرف اُپر ہے فضل خدا
صف عشاق میں امام کیا

اے ہوش ربا سندر مجھہ پاس تک آتے جا
رشتے کوں محبت کے بازو پہ بندھاتے جا

یوں دل منیں ہے خواہش تجھہ گھر کی طرف آؤں
تک ناؤں بتاتے جا یا ٹھاؤں بتاتے جا

دیدار ستی اپنے، محروم نہ رکھہ مجکوں
انچل کوں اُٹھا مکھہ سوں تک درس دیکھاتے جا

مغرور نکو ہو توں اس حسن پہ اے ناداں
یو سب ہے فنا آخر گن بی کماتے جا

لاگی ہے نظر جن کی اے رشک پری تجھہ کوں
دو بیم کے اچھر سوں ان پاس چھڑاتے جا

کر رام اِتا مجکوں مشتاق ہو آیا ہوں
تک رام کلی مہانے یک تان سناتے جا

اے کانِ ادا سندر اشرف ہے ترا طالب
تک پیار ستی اس کوں چھاتی سوں لگاتے جا

عشق تیرے میں بسکہ ہوں بیتاب　　بیقراری ہے دل کوں جیوں سیماب

تجھ جدائی میں خواب آوے نہیں　　گر مہیا ہو بستر سنجاب

نکتۂ خال کوں وو بوجھیا ہے　　جس نے تجھ حسن کی دیکھیا ہے کتاب

تجھ جبیں پر عرق کی بوندیاں دیکھ　　شرم سوں گوہراں ہوے ہیں آب

حسن تیرے کی جھلجھلات کوں دیکھ　　پردۂ ابر میں چھپیا مہتاب

دیکھ تجھ حسن شعلہ خیز کوں شمع　　اشک سوں جل ہوی ہے گل گل آب

بیگ دی سوں خبر لے اشرف کی
تجھ پرت میں ہے بےخور و بے خواب

تجھ دہانِ کا العدم سوں غنچۂ گل ہے خجل

تجھ لب میگوں کی کیفیت انگے مل ہے خجل

عشق نے جب سوں مرے دل کے چمن میں گل کیا

بوستان عاشقی میں تب سوں بلبل ہے خجل

نغمۂ مطرب ہے از بس نشاء بخش اس بزم میں

شیشۂ خالی نمن آواز قلقل ہے خجل

نو خطاں کے حسن کے دریا سیں ہوں میں آشنا

موج خط عنبریں سوں ان کی کاکل ہے خجل

گل رخاں کے حسن سوں از بسکہ ہے رشک ارم

سر زمین ہند سوں کشمیر و کابل ہے خجل

پیچ و تاب زلف شبرنگ پری گوں دیکھ کر

دامن دشت پریشانی میں سنبل ہے خجل

گلشن اشعار اشرف بسکہ ہے رنگیں بہار

عندلیب طالب گلزار آمل ہے خجل

ہے تجھہ حسن کے وصف کا جب سوں بیاں مجھے
کہتے ہیں تب سوں اہل سخن درفشاں مجھے

لکھتا ہوں مو قلم سوں اپس ضعف کا بیاں
از بسکہ ہے تصورِ نازک میاں مجھے

رشک یمن کیا ہے دل اس رشک مہر نے
اپنے عقیق لب پہ دیکھا رنگ پاں مجھے

اشرف ہوں درد عشق سوں ہمرنگ کہربا
کہتا ہے بسکہ کاہ نمن ناتواں مجھے

دیکھیا ہے جب سوں وو شہ ابروکماں مجھے کیتا ہے اپنے تیرِ نگہ کا نشاں مجھے
جیوں برق جلوہ گر ہو گیا ہے سپند وار وو شہسوار تازی آتش عناں مجھے
عاشق کے حق منیں دیکھو کیا ناز شوخ ہے ماریا نگاہ تیز سوں دلبر سناں مجھے
آزاد دیکھہ زلف چلیپا کی موج (سوں) زنجیر بی کیا ہے سہی قامتاں مجھے
رکھتا ہوں آہ تیشۂ فرہاد کوہکن ہے جب سوں عشق خسرو شیریں زباں مجھے
دقت نپٹ ہے نت مرے نازک سخن منیں سر مشق فکر جب سوں ہے وو مو میاں مجھے
اس شمع رو کی جب سوں ہے اشرف مجھے لگن پروانہ ساں نہیں ہے کدہیں خوف جاں مجھے

ادب

تاریخ و سیر

متفرقات

اردو کے جدید رسالے

خاص نمبر

دریاے لطافت

مطبوعہ و شایع کردۂ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن - صفحات مع مقدمات وغیرہ سوا چار سو - کاغذ، طباعت وغیرہ عمدہ - قیمت مجلد تین روپے غیر مجلد دو روپے آتھہ آنے

یہ اردو زبان کے نامور شاعر سید انشاالله خاں انشا کی تالیف ہے- جس میں اردو صرف و نحو، منطق، عروض و قافیہ اور معانی و بیان سے بحث کی گئی ہے - اس کے دو حصے ہیں - پہلے حصے میں صرف و نحو کا بیان ہے - یہ سید انشا کی تصنیف ہے - دوسرا حصہ جس میں منطق، عروض وغیرہ سے بحث کی گئی ہے مرزا قتیل کی تالیف ہے - پہلا حصہ کتاب کی جان ہے - اس میں اردو کے قواعد، محاورات اور روزمرہ پر نہایت تحقیق اور خاص اصول و ترتیب کے ساتھہ بحث کی ہے - اور تمام مسائل پر محققانہ اور ناقدانہ روشنی ڈالی ہے - سید انشا چونکہ ہندوستان کی

مختلف زبانوں سے بخوبی واقف تھے ' دھلی (جو اس زمانے میں فصاحت اردو کا گہوارہ تھی) کی شاعری کے خاص علم بردار تھے ' اور لکھنو کے جدید دور شاعری کے بنانے میں بھی شریک تھے اس لیے ان مقامات کی زبان کے فرق اور خصوصاً دھلی کے محلے محلے کی زبان کی خصوصیات سے بخوبی واقف تھے - انہوں نے ھر محلے ' طبقے اور پیشے کی زبان کی خصوصیات اور ان کے باھمی اختلافات کو بڑی باریک نظری سے دکھایا ھے - اس کے سوا ھندوستان کے مختلف صوبوں کی بولیوں سے بھی بحث کی ھے - اپنی تحقیق سے زبان کے ایسے قواعد منضبط کیے ھیں کہ وہ آج تک کم و بیش برقرار ھیں - کتاب کے وہ حصے خاص طور سے دلچسپ ھیں جن میں سید انشا نے کسی خاص محلے ' طبقے ' پیشے یا صوبے کے محاورہ یا روز مرہ کو فصیح یا غیر فصیح یا کسی قاعدہ کو صحیح یا غیر صحیح اور مستند یا غیر مستند قرار دیا ھے - ایسی اکثر باتیں وہ اپنے ذوق کی بنا پر لکھ گئے ھیں - بے شبہ ان میں سے اکثر آج تک وھی مروج ھیں اور تسلیم کیے جاتے ھیں جن کے حق میں انشا نے اپنے ذوق کی بنا پر فیصلہ کیا تھا ' لیکن بعض محاورے ' الفاظ اور قاعدے ایسے بھی ھیں جو سید انشا کی نظر میں غلط ' غیر فصیح یا غیر مستند تھے لیکن آج وہ صحیح ' اور فصیح اور مستند ھوگئے ھیں - یہ چیزیں لسانیات کے طالب کے لیے خاص دلچسپی کا باعث ھیں - اسی طرح انشا نے بعض اساتذہ پر تنقید کی ھے - ایک اعتراض مرزا سودا پر یہ کیا ھے کہ وہ " لپک ' جھپک والے قصیدے میں کٹک بمعنی لشکر محض قافیے کی ضرورت سے استعمال کر گئے ھیں ...... - کٹک ھرگز اردو کا لفظ نہیں " - اس کے ثبوت میں ایک تو سکندر کا مارواڑی زبان کا مرثیہ پیش کیا ھے اور دوسری سند بخت سنگھ مارواڑی کی نثر سے پیش کی ھے - انشا نے یہ

عجیب بات لکھی ہے - کٹک سنسکرت زبان کا لفظ ہے اور ہندوستان کے مختلف صوبوں کی بولیوں میں وہیں سے آیا ہے - قدیم اردو شاعروں نے بھی اس لفظ کو استعمال کیا ہے چنانچہ سودا اور سکندر سے تقریباً ایک سو سال قبل نصرتی نے بھی اس لفظ کا استعمال کیا ہے - اس کے سوا قدیم اردو لغت کی کتابوں میں بھی یہ لفظ پایا جاتا ہے - ایسی صورت میں اس کو خالص مارواڑی زبان کا لفظ کہنا صحیح نہیں —

دریاے لطافت میں کئی ایسی باتیں موجود ہیں جن پر بحث مباحثہ اور گفتگو کی ضرورت ہے - زبان و ادب کے طالبوں کے لیے یہ بہت بڑا سرمایہ ہے ان کو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہیے - اس سے زبان و ادب کے عجیب و غریب نکات ہاتھ آتے ہیں —

یہ کتاب ۱۸۰۸ ع میں لکھی گئی تھی جب کہ جدید مغربی علم ادب کی پرچھائیں ہماری ادبیات پر نہیں پڑی تھیں اور ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو مغربی خیالات اور تحقیق و تنقید کی ہوا تک نہیں لگی تھی لیکن سید انشا کی سلامت ذوق اور باریک نظری کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے تحقیق و تنقید کا وہ راستہ اختیار کیا کہ ان کے پیدا کیے ہوے مباحث اور طریق تحقیق میں وہی تازگی اور جدت برقرار ہے —

لیکن عجیب بات ہے کہ اس قدر اہم کتاب قدردانی اور مقبولیت سے محروم رہی - اس کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ ہمارا ذوق ادب اتنا ترقی یافتہ نہ تھا - دوسرا یہ کہ یہ کتاب بلحاظ مطالعہ سہولت بخش نہ تھی - اس میں بعض جدتیں ایسی تھیں کہ ان سے لطف و آسانی کی بجاے الجھن اور دشواری پیش آتی تھی - مثلاً انہوں نے اپنے ولی نعمت نواب سعادت علی خاں کے اوصاف کی رعایت سے حروف کے

نام بھی عجیب غریب رکھے تھے - الف کو وہ اقبال اور "ب" کو بخشش لکھتے تھے و علی ہذا - الف بے کی سادگی کے مقابلے میں اقبال، بخشش وغیرہ ظاہر ہے کہ کس قدر دشواریاں پیدا کرتے ہوں گے اور قاری کو الجھن میں ڈال دیتے ہوں گے —

مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ نے ۱۹۱۶ ع میں اس کے غیر ضروری اجزا کو حذف کرکے اور طولانی، غیر واضح اور دقت طلب عنوانات وغیرہ کو بدل کر مرتب کیا تھا اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے شایع کیا تھا - یہ سہولت بہم پہنچانے کے بعد بھی اس کی خاطر خواہ قدر نہیں ہوئی غالباً اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کتاب فارسی زبان میں ہے جس سے ہر شخص بآسانی مستفید نہیں ہو سکتا - اس کے افادے کو عام کرنے کی غرض سے انجمن نے اس کا ترجمہ کرایا ہے - ترجمہ اردو زبان کے نامور اور مستند ادیب و شاعر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے فرمایا ہے - ترجمہ نہایت سلیس، پاکیزہ اور صحیح ہے - لایق مترجم نے جگہ جگہ حواشی بھی درج کیے ہیں اور متن کتاب میں بھی توضیحی عبارتیں داخل کی ہیں جن کو مصنف کی عبارت سے ممیز کرنے کے لیے قوسین میں درج کیا گیا ہے - کتاب کے شروع میں ایک بہت تفصیلی فہرست ہے جو انڈکس کا حکم رکھتی ہے - اس کی مدد سے کتاب کے تمام مطالب و مضامین کا حال بہت جلد معلوم ہو جاتا ہے اور ہر چیز آسانی سے مل جاتی ہے - انجمن نے یہ اڈیشن شایع کرکے سید انشا کی عالمانہ تحقیقات کو ہر اردو داں کے لیے عام کر دیا ہے —

(چ)

نکات الشعرا

تالیف میر تقی میر مطبوعہ و شایع کردۂ انجمن ترقیٔ اردو اورنگ آباد دکن - صفحات علاوہ مقدمہ و اشاریہ ۱۸۰ - کاغذ طباعت وغیرہ عمدہ اور دیدہ زیب - قیمت مجلد ۲روپے چار آنے غیر مجلد ایک روپیہ بارہ آنے —

جو لوگ اردو زبان کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ میر کے تذکرہ نکات الشعرا کی اہمیت کو بخوبی جانتے ہیں - یہ اردو شاعروں کے اولین تذکروں میں ہے اور چونکہ ایک مشہور ، مستند اور بلند پایہ استاد کا لکھا ہوا ہے اس لیے خاص اہمیت وحیثیت رکھتا ہے - اس میں ایک سو چار شاعروں کا تذکرہ ہے - گو یہ مختصر ہے لیکن اس میں بہت سی کام کی اور مفید باتیں ملتی ہیں اور ایسے تاریخی اشارے اور ادبی نکات ملتے ہیں جو دوسری جگہ نہیں مل سکتے - میر صاحب نے بڑی تحقیق سے لکھا ہے اور شعرا کا معیاری کلام انتخاب کیا ہے اور جگہ جگہ بڑی استادانہ تنقیدیں کی ہیں - یہ تذکرہ عمدہ اشعار کا انتخاب بھی ہے جس سے عام ناظرین لطف اندوز اور میر کے ذوق سے آشنا ہو سکتے ہیں ، اور شاعروں کے حالات کا مجموعہ بھی ، جس سے تاریخ ادب کے شائقین مستفید ہو سکتے ہیں - اور چونکہ اس میں میر نے بڑی آزادی اور بے باکی سے شاعروں کے کلام پر تنقید اور رائے زنی کی ہے اس لیے یہ تنقید کا بھی عمدہ نمونہ ہے —

اس تذکرے میں اکثر ان شاعروں کا حال ہے جن سے مصنف ذاتی ملاقات اور واقفیت رکھتا تھا ، اس لیے اس میں اکثر مستند اور محققانہ

چیزیں ملتی ہیں - مصنف نے شمالی ہند کے شاعروں کے ساتھہ دکنی اور گجراتی شاعروں کو بھی لیا ہے - اس باب میں مصنف نے عزلت کی بیاض سے استفادہ کیا ہے - کہیں کہیں دکنی شاعروں کے حالات اور اسما وغیرہ میں فرو گزاشتیں نظر آتی ہیں، ان کی تصحیح حواشی میں کردی گئی ہے، جس سے تذکرہ کا پایۂ استناد زیادہ بلند ہوگیا ہے —

اس سے قبل انجمن ترقیء اردو نے اس تذکرے کو شایع کیا تھا لیکن پہلے اڈیشن میں متعدد غلطیاں رہ گئی تھیں - یہ اڈیشن خاص اہتمام اور صحت کے ساتھہ طبع کیا گیا ہے - شروع میں مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کا مقدمہ بھی ہے جو پہلے اڈیشن میں نہ تھا اور آخر میں ایک اشاریہ (انڈکس) ہے جو ہر طرح سہولت بخش ہے —

(چ)

دیوان تاباں

مطبوعہ و شایع کردۂ انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد دکن - کاغذ، طباعت وغیرہ عمدہ - صفحات ۲۸۰ - قیمت مجلد ۲ روپے چار آنے غیر مجلد ایک روپیہ ۱۲ آنے —

میر عبدالحی تاباں دہلوی محمد شاہی عہد کے شاعر ہیں - یہ وہ زمانہ ہے جس میں ایہام گوی کا زور تھا، لیکن اس کے آخر زمانہ میں ایہام گوی کے خلاف بعض شاعروں نے تحریک شروع کردی تھی اور شاعری میں سادگی اور اس کی زبان میں اعتدال و توازن پیدا کیا جا رہا تھا - تاباں کا کلام اس دور اصلاح کی پیداوار ہے - تاباں کا انتقال ۱۱۶۱ ھ اور ۱۱۶۵ ھ کے درمیان ہوا ہے گویا محمد شاہی عہد کے اثرات ابھی پورے طور پر زایل نہیں ہوے تھے - یہ پورا دیوان اسی عہد کے اخیر حصے میں تصنیف

ہوا ہے، اس لحاظ سے اس کی زبان کی صفائی، سادگی اور سلاست لایق داد ہے - تاباں کے کلام میں تخیل کی بلند پروازی نہیں ہے۔ اس کی شاعری عام عاشقانہ مضامین اور بقول میر "گل و بلبل" کی داستان تک محدود ہے - لیکن زبان و بیان کی خوبی اور لطافت کے اعتبار سے دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے - میر نے اپنے زمانے کی شاعرانہ زبان کا لحاظ کرتے ہوے اس کے متعلق بہت صحیح راے دی ہے —

"زبان رنگینش پاکیزہ تر از برگ گل، گلستان سخن را نازک دماغ بلبل، سمند رنگینیء فکرش با گلگون باد بہار طابق النعل بالنعل است - ہر چند عرصۂ سخن او در لفظ ہاے گل و بلبل تمام است، اما بسیار برنگیں می گفت" —

(چ)

حامد کے سو شعر

حامد علی خاں بی-اے - جائنٹ اڈیٹر رسالۂ ہمایوں زیادہ تعارف کے محتاج نہیں - ان کا کلام اور ان کے مضامین ہمایون اور دوسرے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں - ان کے سو شعر کا انتخاب ادبی دنیا کے مدیر منصور احمد صاحب نے کیا ہے اور شروع میں دس صفحوں کا دیباچہ لکھا ہے جس میں شاعر کی خصوصیات شاعری سے بحث کی ہے - انتخاب اچھا ہے اور پڑھنے کے قابل ہے - کتابت عمدہ، طباعت رنگین ہے اور کاغذ بھی اچھا ہے، تقطیع بھی عام سو شعری انتخاب سے کسی قدر بڑی ہے - قیمت چھے آنے - ملنے کا پتا :- دفتر ہمایوں، ۲۲ - لارنس روڈ - لاہور -

(چ)

حضرت احمق کے سواسو شعر

مرتبۂ مرزا ابراہیم بیگ صاحب اڈیٹر سرگزشت علی گڑھ

کچھہ دنوں سو شعری انتخابات کی گرم بازاری رہی۔ اب سوا سو کا آغاز ہوگیا ہے، مشہور کہاوت ہے سیر کو سواسیر - انتخاب کی یہ جدت مرتب نے شاعر کے تخلص اور اس کے رنگ شاعری کے اعتبار سے بہت خوب کی ہے - اکبر کے بعد ظرافت نگاری میں کئی شاعروں نے زور مارا لیکن اس کو اب تک کوئی نہیں پہنچا - حضرت احمق بھی ان ظرافت نگار شاعروں میں ہیں جو اکبر کے رنگ میں کہتے ہیں- ان کا کلام اکثر رسائل و اخبارات میں شایع ہوتا رہا ہے اس لیے وہ کسی تعارف یا تقریب کے محتاج نہیں ہیں- اس مجموعہ میں وہ اشعار نہیں ہیں جن میں سیاسیات پر سختی سے حملے کیے گئے ہیں- مرتب نے شروع میں ایک مختصر دیباچہ لکھا ہے جس میں حضرت احمق کے حالات اور "احمقیات" کا ذکر ہے -

(چ)

---

(۱) صہبائے ولا - (۲) جوش ولا -

مصنفۂ شاہ ابوالحسن محمد مظفر حیدری - چھوٹی تقطیع، صفحات و قیمت علی الترتیب ۱۱، ۲۸ - ڈیڑہ آنہ، تین آنے- مصنف کے پتے، سی - اے - وی - ہائی سکول الہ آباد سے مل سکتی ہے-

صہبائے ولا میں وہ چند نظمیں ہیں جو نعت وغیرہ میں مصنف نے اثنائے سفر حج میں لکھی ہیں- جوش ولا دراصل ایک نعتیہ نظم ہے جو عید میلادالنبی کی ایک محفل میں پڑھی گئی تھی- مصنف کو نعت گوئی

میں اچھا خاصا ملکہ ہے - جو لوگ نعتیہ کلام سے ذوق رکھتے ہیں - ان کے لیے یہ دو کتابچے خالی از دلچسپی نہ ہوں گے —

(چ)

اتالیق الصبیان

مصنفہ ڈاکٹر احمد شاہ صاحب - صفحات ۱۷۳ - قیمت ایک روپیہ چھہ آنے علاوہ محصول ڈاک - مصنف کے پتے' نور منزل' ڈاک خانہ راج پور' دھرہ دوں سے مل سکتی ہے -

یہ نظموں کا مجموعہ ہے جس کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ "۳۲ سالہ خدمت سے سبک دوش ہونے کے بعد ہمالہ کے پہاڑوں میں آخری دن بسر کرنے کا ارادہ کیا اور قریب ساڑھے چار سال سے یہاں مقیم ہوں - کچھہ عرصہ یہاں رہنے کے بعد اکثر خیال ہوا کہ وقت گزارنے کے لیے کوئی دلچسپ مشغلہ ضرور ہونا چاہیے اور مشغلہ ایسا ہو جو دلچسپ تو ضرور ہو مگر کچھہ مفید بھی ثابت ہو" - چنانچہ یہ مجموعہ اس دلچسپ مشغلۂ کی پیداوار ہے - جس کے لکھنے کا مدعا یہ ہے کہ بچوں کو ہندوستان کی مختلف چیزوں سے باخبر کیا جاے - اس میں تقریباً سوا پانسو نظمیں ہیں جن کو پانچ مختلف عنوانات کے تحت درج کیا گیا ہے - (۱) حیوانات' اس میں ۷۵ جانوروں کا ذکر ہے - (۲) مصنوعات' ان کی تعداد ایک سو ایک ہے - (۳) نباتات' ۱۷۶ - (۴) پیشہ ور ۱۶۳ - (۵) متفرق ۸ —

ہمارے ملک کے نہ صرف بچے بلکہ جوان اور بوڑھے تک مختلف جانوروں' پرندوں' پودوں اور پھولوں وغیرہ کے ناموں سے ناواقف ہوتے ہیں' اور ان کی خصوصیات اور خاص خاص حالات سے بے خبر - ہماری

زبان میں کوئی ایسی جامع کتاب نہیں ہے جو خاص ہندوستانی چیزوں پر لکھی گئی ہو - ڈاکٹر احمد شاہ صاحب کو یہ خیال بہت خوب پیدا ہوا - لیکن انہوں نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ ہمارے خیال میں صحیح نہیں ایسی چیزوں کا بیان خواہ کتنی ہی دلآویز اور دلچسپ نظم میں کیوں نہ ہو زیادہ مفید نہیں ہوسکتا - نظم کی پابندیاں وضاحت و تشریح چاہتی ہیں - ایسی حالت میں بچوں کے لیے اکثر ان چیزوں کو جو ان کی نظروں سے نہیں گزری ہیں نظم میں بیان کرنا ناقابل فہم نہیں تو سریع الفہم بھی نہیں - اگر اس میں تصاویر ہوتیں تو بھی آسانی ہوتی - موجودہ صورت میں اس سے صرف لفظی تعریفیں معلوم ہوسکتی ہیں، لیکن اشیا وغیرہ کی اصل حقیقت سے واقفیت پیدا نہیں ہوسکتی -

(چ)

مرقع سخن حصہ اول و دوم

مصنفۂ ڈاکٹر مبارک حسین مبارک عظیم آبادی - صفحات و قیمت علی الترتیب ۸۴، ۲۰۰، آٹھ آنے، بارہ آنے - مصنف کے پتے، پٹنہ سٹی ڈاک خانہ بیگم پور محلہ چوراہا آغا حسینا سے مل سکتی ہے ---

ان دونوں حصوں میں مصنف نے اپنی طبع زاد نظمیں جمع کی ہیں - پہلے حصے میں ۴۰ نظمیں ہیں اور دوسرے حصے میں ۸۸ - ان کے موضوعات مختلف و متنوع ہیں، لیکن زیادہ تر صوبۂ بہار سے متعلق ہیں، ان میں بھی بیشتر ایسی ہیں جو خاص خاص تقریبوں سے لکھی گئی ہیں - مثلاً کسی کے صاحبزادے کی تسمیہ خوانی، تعمیر مکان، کسی خاص غرض کے

لیے چندہ' کسی کے اضافۂ تنخواہ کی التجا' دوستوں یا ذی اثر لوگوں کی اونچے عہدوں پر ترقیاں' کسی طالب علم کا امتیاز سے امتحان پاس کرنا' کسی مسجد کی ترمیم کے لیے عرض داشت اور چندے کی اپیل' ٹی پارٹی' وداعی جلسہ' شادی اور دعوتوں کے رقعے' مبارکبادیں' تہنیتیں' کلب کے فوٹو وغیرہ وغیرہ --

مصنف کی غرض ان مجموعوں سے یہ ہے کہ طلبا کے نصاب میں شریک کیے جائیں' پہلے حصے کو وہ ہائی اسکول کی آٹھویں اور نویں جماعتوں کے لیے موزوں بتاتے ہیں' اور دوسرے حصے کو دسویں (میٹریکولیشن) کے لیے - مصنف ایک مشاق اور دیرینہ سال شاعر ہیں ان کا بیان ہے کہ

" راقم ۴۵ سال سے اردو کی بقا کے لیے اپنی ہستی کو فنا کر رہا ہے -
مجنوں بنا ہوا ہے جو یہ سر سے پاؤں تک لیلیٰ کی شکل کھینچ رہا ہے قلم میرا! "

اس دیرینہ تجربے کے مقابلے میں مجال لب کشائی نہیں' تاہم باادب یہ کہنے کی جسارت کی جاتی ہے کہ یہ مجموعے طلبا کی نصابی ضرورتوں کو شاید ہی پورا کریں - نظم کے موضوعات بہت وسیع ہیں جن سے طلبا کو اپنی تعلیم کی ابتدائی منزل پر باخبر ہونا لازم ہے - اس نصابی مسئلے کا حل اب تک صرف یہی سمجھا جاتا ہے کہ مختلف اساتذہ کے کلام کا انتخاب کیا جاے اور اس طرح طلبا کو ہر استاد کے رنگ سے واقف کرایا جاے - اس سے طلبا میں بصیرت پیدا ہوتی ہے اور وہ نظم کو سمجھنے اور اس کی اصلی روح سے آشنا ہونے کی صلاحیت پیدا کرلیتے ہیں - کسی ایک شاعر کا کلام پڑھانے سے یہ مقصد پورا نہیں ہوسکتا ــ

(چ)

سلسبیل

مجموعۂ کلام جناب آل احمد صدیقی سرور ایم - اے (علیگ)
سلسلۂ مطبوعات انجمن اردوے معلی نمبر ا کاغذ معمولی -
کتابت و طباعت اچھی - صفحات ۱۱۲ - قیمت ایک روپیہ -
ملنے کا پتا - درج نہیں —

کسی قوم کے انحطاط کا اندازہ لگانے کے لیے ایک یہی مشاہدہ کافی ہے کہ اس کے افراد میں شعر خوانی اور شعر گوئی میں تمیز باقی نہیں رہتی' یعنی ہر شعر خواں شعر گوئی کی طرف مائل ہوجاتا ہے - یہ رجحان ایک خاص قسم کی ذہنیت کا پتا دیتا ہے - جہاں ہمارے ملک میں ضبط اولاد اور ضبط نفس کی تحریکیں شروع ہوچکی ہیں کاش شعر و ادب میں بھی کسی قسم کا ضابطہ نافذ ہو سکے اور گم کردہ راہ شاعر نما حضرات اپنے اصلی رستوں کو پہچان جائیں -

'نژاد نو' کا ہر شاعر اپنا مجموعہ اس شان کے ساتھ مرتب کرتا ہے کہ ورق الٹتے ہی اس کی تصویر پر نظر پڑے پھر ایک مرعوب کن مقدمہ اور 'ہدیۂ محبت' ہو - چنانچہ یہ صفحات بھی ان صفات سے خالی نہیں ہیں - بقول سرور صاحب ان کا "تخیل کشمیر کی بہاروں میں جوان ہوا ہے" - لہذا یہ ہدیہ بھی انہیں بہاروں کے نام ہے - ان نظموں اور غزلوں کو پڑھنے کے بعد ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑا 'اے وائے بہارے اگر ایں مست بہارے !' نظموں کے علاوہ جن میں سے بیشتر مناظر کشمیر سے متاثر ہو کر لکھی گئیں مولانا محمد علی مرحوم کا ایک مرثیہ اور کئی غزلیں بھی اس مجموعے میں شامل ہیں —

شروع میں رشید احمد صاحب صدیقی نے اپنے مخصوص انداز میں ایک تعارف تحریر فرمایا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "سرور صاحب

اپنے کارناموں کے اعتبار سے فسانۂ عجائب سے کم نہیں ہیں" - ہمارا خیال ہے کہ خواجہ حسن نظامی اور رشید احمد صاحب صدیقی اگر ایک دوسرے کو اپنی تحریریں دکھا لیا کریں تو وہ زیادہ دلچسپ اور شگفتہ ہو جائیں - خواجہ صاحب کا پیرایہ اتنا یک رنگ و ہموار ہے کہ اسے رشید صاحب کا پیچ و خم کسی نہ کسی قدر ملنا چاہیے - اور رشید صاحب کے تحریری بھول بھلیاں میں خواجہ صاحب کی سادگی ایک نئی بات پیدا کر دے گی —

مصورانہ شاعری کے بھی خارجی اور داخلی پہلو ہوتے ہیں - یا تو شاعر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ الفاظ کی گل کاریوں سے چمن بندی کر دے، پہاڑ کی بلندیوں کو آسمان سے ٹکرا دے، اور دریاؤں میں ایسے بھنور ڈال دے کہ ناظر سکتے میں آجاے اور سمجھ نہ سکے کہ یہ نظارہ خواب میں دیکھا تھا یا بیداری میں - یا پھر شاعر ان مناظر سے اثر پزیر ہو کر اپنے محسوسات کو یوں بیان کرے کہ سننے والے پر وہی کیفیت طاری ہو اور وہ ان تماشوں کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو جاے - جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری کے کلام میں خارجی منظر کشی کے عمدہ نمونے ملیں گے - لیکن پیش نظر نظموں میں شاعر نے اپنے کو اُجاگر رکھنے کی اتنی کوشش کی ہے کہ تصویر کہیں نہیں رہی، صرف مصور رہ گیا اور اس کے جذبات میں وہی فرسودہ رومانی کیفیت ہے جو ہمارے اکثر رومانی نظم نگاروں کا طرۂ امتیاز ہے - ان کی جوانی پیٹھ پر کتابوں کا پشتارہ لادے ہوے عینک کے وسیلے سے حسن و عشق کی رنگینیوں کا جائزہ لے رہی ہے - سرور صاحب اپنے ہم عصروں کی طرح اس جوانی کے احساسات کو خوبصورت الفاظ کے پردوں میں بھی چھپا نہ

سکے - اجنبی ترکیبیں اور ناموزوں بندشیں جابجا نظر آتی ہیں —

"مرے دل میں بھی لہریں سی کئی بے ساختہ اُٹھیں" - (صفحہ ۲۷)

لہروں کی بے ساختگی یعنی چہ؟

حباب احمریں کی شوخیاں فرش زمرد پر

مرا وہ راز جو یوں بر ملا افشا نظر آیا (صفحہ ۲۸)

دونوں ہی مصرعے زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے —

عروس شعر نے پردہ اُٹھایا روے روشن سے

بڑھے اہل نظر ساغر بکف شاخ نشیمن سے (صفحہ ۴۱)

گویا شاخ نشیمن پر پنچھیوں کی طرح اہل نظر اس تاک میں بیٹھے رہتے ہیں کہ شاعری کی دیوی بے نقاب ہو اور یہ اس کی طرف پر پھیلائیں —

"یا میرے ذوق نظر کی آخری پرواز ہے" - (صفحہ ۴۷) نظر کی پرواز بھی ذوق نظر کی، پرواز اور وہ بھی آخری پرواز! سمند ناز پر یہ تازیانہ!

"مگر لبوں پہ یہی ایک دعا نظر آئے" - (صفحہ ۶۹)

دعا نظر بھی آسکتی ہے یہ ہمیں آج معلوم ہوا -

نظموں میں صرف ایک پرواز خیال اچھی ہے اور اس میں بھی اس اس قسم کے مصرعوں کی فراوانی ہے "تمام دیدۂ حیرت بنا ہوا ہوں میں -"

غزلوں پر اصغر گونڈوی کا اثر صاف نمایاں ہے اور کہیں کہیں جگر مرادآبادی کی پیروی کی کوشش بھی کی گئی ہے - ان دونوں کی غزلوں پر طبع آزمائی بھی کی گئی ہے اور نتیجہ جس صورت میں

برآمد ہوا وہ ملاحظہ ہو :

" تارے 'اجالتے' ہیں میری گرد راہ کو" (صفحہ ۸۲)

" وہ روشنی ہو رہی ہے دل میں کہ 'مشعلیں جگمگا رہا ہوں' (صفحہ ۸۷)

" سرور بزم کو اتنا 'چھکا' نہ دوں تو سہی' (صفحہ ۱۰۱)

" ہزاروں لولوے لالہ لیے بیٹھا' ہوں محفل میں -" " خرام موج سے لولوے تہہ نشیں بہتر -"

غرض غزلوں سے نظمیں پھر بھی غنیمت ہیں کہ ان گھڑ اور بے جوڑ ترکیبوں کے لیے ان میں کسی نہ کسی طرح گنجائش نکل ہی آتی ہے -

غزلوں میں وہی چوچلے ملیں گے جنھیں رشید صاحب نے اپنے دیباچے میں "شورہ پشت" شاعروں کے لیے مخصوص کیا ہے - ان کے عشق کی داستان ان ابواب میں تقسیم کی جاسکتی ہے -

پہلا سین : " ہزاروں لولوئے لالا لیے بیٹھا ہوں سینوں میں" - (صفحہ ۸۱)

دوسرا سین : " زیر و زبر ہے قافلہ صبر و قرار کا " - (صفحہ ۹۴)

تیسرا سین : " پیشانیوں پہ نور حرم لے کے آئے ہیں " - (صفحہ ۳۰)

چوتھا سین : " اور بڑھتا جا رہا ہے بار سر کو کیا کروں" - (صفحہ ۱۰۹)

ڈراپ سین : " حضور حسن میں دل باریاب ہو نہ سکا " - (صفحہ ۸۷)

یہ مختصر سی رویداد ہے ہماری 'شورہ پشت شاعری' کی' جس کا نمونہ یہ مجموعہ ہے —

(ناخدا)

خمستان

اثر صہبائی کے کلام کا مجموعہ

صفحات مع مقدمہ وغیرہ - تقریباً ۳۰۰ - کاغذ کتابت و طباعت اچھی -

قیمت ۲ روپیہ ۸ آنہ ملنے کا پتا - آزاد بک ڈپو، سیالکوٹ، پنجاب -

جناب اثر صہبائی پنجاب کے مقبول اور ممتاز نوجوان شاعر ہیں - خمستان ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے - اس میں غزلوں اور رباعیوں کے علاوہ نظمیں اور قطعات بھی ہیں —

مجموعے کے آغاز میں " دنیائے ادب کے مایۂ ناز ادیب " (بقول مصنف) سید سلیمان صاحب ندوی نے جرعۂ مئے کے عنوان سے ایک مقدمہ تحریر فرمایا ہے اور پنڈت کیفی صاحب نے بھی اس سنت کی پابندی کی ہے - سید صاحب نے اس مقدمے میں ایک بڑی دلچسپ بحث یہ کی ہے کہ اہل حدیث حضرات شاعر ہوتے ہیں یا نہیں —

مجموعے کا پہلا باب ' تجلیات ' غزلوں پر مشتمل ہے اور غالباً سب سے زیادہ طویل ہے - غزل گوئی کی صنف نہایت نازک اور مشکل ہے اور یوں صنفی اعتبار سے کوئی اس پر عبور حاصل بھی کرلے لیکن خود فراموشی کا وہ جذبہ کم کو میسر ہوتا ہے جو عشقیہ شاعری کی جان ہے اور جس کے بغیر غزل بالکل روکھی پھیکی رہ جاتی ہے - ہمارا خیال ہے کہ اثر صاحب کی طبیعت حکمت اور فکر کی طرف زیادہ مائل ہے اور ان میں ایک خاص قسم کا ضبط ہے - اس لیے اسی صنف میں انہیں جولانی طبع کا زیادہ موقع ملے گا جو اس قسم کے رجحان کے لیے موزوں ہو - غزل جس قسم کی صناعی اور خود فراموشی کی طالب ہے وہ اثر صاحب کو ودیعت نہیں ہوئی - چنانچہ غزلوں میں فی الجملہ بہت کم ایسی ہیں اور ان میں بھی ایسے اشعار کم ہیں جو دل میں اتر جائیں - ایک طرف ایسی غزل موجود ہے :—

دنیا میں ہزاروں خوشیاں ہیں ، یہ دنیا عشرت خانہ ہے

اس بزم میں لیکن میرا بھی ایک درد بھرا افسانہ ہے

برگشتہ قسمت والوں کا نے کعبہ نے بتخانہ ہے
ہاں دو ہی سہارے ہیں ان کے - یا موت ہے یا پیمانہ ہے

ہر شاخ جب ایک مستانہ ہے ہر پھول جب ایک پیمانہ ہے
توبہ! ایسے میں توبہ ؟ جب فطرت خود میخانہ ہے

کچھ فرق نہیں ہم مستوں کے کاشانے اور میخانے میں
کاشانہ ہی میخانہ ہے میخانہ ہی کاشانہ ہے

اثر صاحب کی بہترین غزلوں میں سے یہ ایک ہے پھر بھی مقدمہ نگار کو بصد تکلف اس کے ہر شعر پر اصلاح دینے کی ضرورت محسوس ہوئی - کہیں کہیں " بخت واژوں " (صفحہ ۱۴) جیسی عجیب ترکیبیں ملیں گی جو الفاظ کے ترنم کے ساتھہ بگل کی آواز کا کام کرتی ہیں - اس میں شک نہیں کہ بسااوقات ایسے شعر بھی نکل آتے ہیں کہ سخن شناس سوچتے رہ جائیں کہ شاعر کیا کہہ گیا :

جستجوے منزل میں بے قرار و آوارہ
میں بھی ایک منظر ہوں موجہاے دریا کا

رہرو محبت کے ہر قدم پہ منزل تھی
حسن کا تھا آینہ ذرہ ذرہ صحرا کا

زندگی سوز ہے کہ تادم زیست ختم پر آہ آتشیں نہ ہوئی
آستانے نگاہ سے گزرے مایل بندگی جبیں نہ ہوئی

کچھہ شغل زندگی کے لیے بھی تو چاہیے
تقدیر سے اگر نہ لڑے کیا کرے کوئی

لیکن ایسے اشعار خال خال ہی ہیں —

دوسرا باب بعنوان 'سمن زار' نظموں پر مشتمل ہے اور یہاں شاعر

کو اپنے اس نظریۂ شباب کے پھیلانے کا خوب موقع ملا ہے جس کی تشریح وہ پہلے کر چکا ہے :-

کیف آفریں ہے یاد جوانی رسوائی و رندی و بت پرستی

چنانچہ یہاں شیب و شباب کی رنگینیاں ابلی پڑتی ہیں - غزلوں سے کہیں اچھی ہیں ' خصوصاً بہاریہ اور '' محبت اور موت '' خوب ہیں -

' جام صہبائی ' رباعیات کے لیے وقف ہے اور یہ اثر صاحب کا خاص میدان ہے - شاید یہ مبالغہ نہیں کہ جگت موہن لال رواں آں جہانی کے بعد امجد حیدر آبادی اور اثر صہبائی اس اقلیم سخن کے آلہا اودل ہیں -

ہماری شاعری کی بد نصیبی ہے کہ اس کا رکن اول نوحہ خوانی قرار پاگیا ہے اور ولی دکنی سے لے کر دور حاضر تک کے جس شاعر کو دیکھیے چرخ کج رفتار کو بددعائیں دیتا اور دامن و گریباں کے درپے ہوکر اپنے افلاس میں زیادتی کرنے پر تلا رہتا ہے - وجہ یہ ہے کہ ہماری سوسائیٹی میں انسان کی تمنائیں قدم قدم پر پامال ہوتی ہیں اور ان کی تکمیل کا موقع بہت کم ملتا ہے - خصوصاً اب حالات ایسے ہوگئے ہیں کہ ہمارے نوجوان زیادہ حساس ہوتے جاتے ہیں کیونکہ ان کے ارادوں کی تکمیل کے تمام راستے بند ہیں اور اس کا رد عمل لامحالہ حزنیت کی صورت میں ہوگا - اثر صاحب جس اندوہ و ملال کی تلچھٹ پی رہے ہیں وہ فطری نہیں بلکہ ماحولی ہے - امید ہے کہ وہ بہت جلد اس مہلک مرض کو اپنے دامن سے جھٹک دینگے اور اس کا آئندہ مجموعہ نوحۂ غم نہیں بلکہ پیام عمل ہوگا —

کچھہ رباعیات درج کی جاتی ہیں جو اثر صاحب کے مخصوص رنگ میں ہیں اور حق یہ ہے کہ خوب ہیں -

صحرائے جہاں میں ایک فریاد ہوں میں ظلمات فلک میں برق آباد ہوں میں
جویائے سکون جاوداں ہوں یعنی ناشاد ہوں بیتاب ہوں برباد ہوں میں
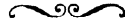
جو لطف ہے جستجو میں حاصل میں نہیں لذت جو تگ و دو میں ہے منزل میں نہیں
وہ منظر زندگی کہ امواج میں ہے کشتی میں نہیں، سکوت ساحل میں نہیں

تاراج خزاں ہوں اور رقصاں ہوں میں گلہائے بہار میں پریشاں ہوں میں
لذات و علم بھی ایک معمہ ہیں اثر خوش رنج میں اور خوشی میں گریاں ہوں میں

ہو جائے عیاں جو مجھ پہ ہستی میری پھر کوئی سنے صدائے مستی میری
معبود ہوں آپ ہی عبادت کس کی؟ ہے بے خبری خدا پرستی میری

خوب کہا —

بہ ایں ہمہ، شاعر کہیں کہیں جذبات کے تلاطم میں بہہ جاتا اور ایسی باتیں کہہ جاتا ہے کہ مقدمہ نگاروں کے 'مشوروں' کے باوجود وہ کانوں کو کھٹکتی ہیں - رباعیات میں فرط بے نیازی سے کبھی کبھی مصرعوں میں ایسی تکرار ہونے لگتی ہے جو ناگوار معلوم ہوتی ہے : -

" کیوں شکوۂ روزگار اے دل اے دل
دنیا تیری ہے میں بھی تیرا، تیرا
مرنا تو میں جانتا ہوں - ہوگا ہوگا "

'راحت کدے' میں شاعر نے اپنی رفیقۂ حیات کی یاد میں جو قطعات کہے ہیں ان میں سے کئی بہت پر درد ہیں اور بتلاتے ہیں کہ خلوص جذبات صحیح صناعی کی سب سے بڑی ضمانت ہے :

سحر کے روئے رنگیں سے نقاب اٹھائے جاتے ہیں
دل محزوں پہ لیکن غم کے بادل چھائے جاتے ہیں
تمہارے ہجر میں باد صبا ایک آہ غم گیں ہے
نہیں تم جلوہ گر تو پھول بھی مرجھائے جاتے ہیں
تمہارے غم ربا جلوے عیاں ہیں لالہ زاروں میں
تمہارے دل نشیں نغمے رواں ہیں آبشاروں میں
تمہارا روئے رنگیں ماہ تاباں میں درخشاں ہے
تمہاری مسکراہٹ رقص کرتی ہے ستاروں میں

اثر صاحب قدرت کی طرف سے شاعرانہ دل و دماغ لے کر آئے ہیں اور ان کا مستقبل روشن ہے - مشق کے ساتھہ پختگی آتی جائے گی اور اگر ان کے مشاہدے کا دائرہ وسیع ہوگا اور وہ عوام کے دکھہ اور اس کے مداوے کو سمجھہ سکے تو ان کے کلام میں وہ شگفتگی ضرور آجائے گی جس کی توقع ایک شباب پرور شاعر سے کی جاتی ہے —

(ناخدا)
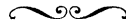
(۱) سودیشی اردو (۲) ضروری کہانیاں -

(مصنفۂ قاضی عبدالصمد صاحب - کاغذ طباعت و کتابت ' قیمت - پہلی میں ۳۰ صفحات ہیں اور قیمت چار آنے ہے - دوسری میں ۷۲ صفحات ہیں اور قیمت چھہ آنے ہے - ملنے کا پتا - مولوی محمد ادریس میرٹھی - مکتبہ شرقیہ - دہلی)

دونوں کتابیں اسکول کی ضروریات کو مد نظر رکھہ کر لکھی گئی

ہیں اور اس لائق ہیں کہ ہمارے طلبہ انہیں بار بار پڑھیں —

سودیشی اردو سید انشا کی 'رانی کیتکی کی کہانی' اور ہندی کے مشہور شاعر ہری اودھ کی 'ٹھیٹھ ہندی کے ٹھاٹ' کے طرز کی کتاب ہے - خوبی یہ ہے کہ فارسی اور عربی کا ایک لفظ نہ ہوتے ہوے بھی زبان پاکیزہ اور فصیح ہے - اگر اس قسم کی کتابیں برابر اشاعت پزیر ہوا کریں تو اس تحریک کو بڑی تقویت ہوگی جو مولویانہ اردو اور پنڈتانہ ہندی کی جگہ بول چال کی زبان کو ملک کی مشترکہ قومی زبان بنانا چاہتی ہے -

دوسری کتاب بھی بہت مفید ہے اور اسکی تالیف کا مقصد نہایت مستحسن ہے - یہ ہندوستان کے ایسے تاریخی واقعات کا مجموعہ ہے جن سے (۱) اہل ملک میں باہمی محبت اور حب وطن کے جذبات پیدا ہوں - (۲) جن سے اچھا اخلاقی سبق حاصل ہو - (۳) جن حکمرانوں کے متعلق بعض اشتعال انگیز واقعات مشہور ہیں ان کے وہ واقعات لکھے جائیں جن سے بدگمانیاں رفع ہوں —

یہ امر کتنا افسوسناک اور باعث شرم ہے کہ ہمارے ملک میں جہاں آے دن ایسی تحریکیں اتھا کرتی ہیں جن سے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھتی جاے اور ایسی تحریریں بکثرت شایع ہوتی ہیں جن میں سے دلوں کی سیاہی کاغذ پر انڈیلی جاتی اور باہمی منافشت کی آگ کو ہوا دی جاتی ہے ' وہاں اتحاد و رواداری کا جھنڈا برابر خاک بسر ہے اور کم لوگ ایسے ملتے ہیں جو اس خلیج کو پاتنے کی کوشش کریں - اس قحط الرجال میں ایسی کوششیں لائق ستایش ہیں —

کیا اچھا ہو کہ ہماری قوم کے نو نہال ان افترا پرداز تاریخوں کو پڑھنے پر مجبور نہ کیے جائیں جو اوائل عمر سے ان کے دلوں میں کینہ و تعصب کے

جذبات پیدا کرتی ہیں - اور اس قسم کی کتابیں ان کے ہاتھہ میں ہوں جو یک جہتی اور قومیت کی روح پھونکیں !

" ناخدا "
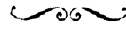
منتخب افسانے

مترجمہ ملیح آبادی صاحب - حجم ۵۰۰ صفحات - کاغذ ' کتابت و طباعت معمولی - قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتا ہند بک ایجنسی چت رنجن ایونیو ' کلکتہ '

مترجم نے مشرق و مغرب کے شہرۂ آفاق افسانہ نگاروں کے ۳۸ افسانوں کو اردو میں منتقل کیا ہے - افسانہ نگاروں یا افسانوں کے انتخاب میں کوئی خاص التزام ملحوظ نہیں ہے - ترجمے کے متعلق یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ " افسانہ نگار کی اسپرٹ کو سمجھہ کر اسے اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے "- ہمارے خیال میں یہ طریقہ کسی طرح مستحسن نہیں ہے - جب تک آرتست کی لغوی اور معنوی خوبیاں برقرار نہ رہیں اس کے کمال کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا - افسانہ ایک unit ہے جس کی اسپرٹ اگر روح ہے تو پیرایۂ بیان جسم ہے - ' قالب میں ڈھالنے ' والی ترکیب سے قصہ ہی قصہ باقی رہ جاتا ہے اور لطف بیان کی تمام نزاکتیں ضایع ہوجاتی ہیں - ان میں سے کئی افسانے انگریزی میں ہماری نظر سے گزر چکے ہیں اور ہمیں یہ کہنے میں تامل ہے کہ ترجمہ میں اصل کے حسن کی ایک جھلک بھی موجود ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر تراجم عربی سے چھن کر اردو میں پہنچے ہیں اور اس صورت میں نگارش کی دلکشی کا باقی رہنا محال ہے - ترجمے کی عبارت یک رنگ ہوتے ہوئے بھی صاف اور سلیس ہے - ایک دو قصوں کے ساتھہ مصنف کا نام نہیں ہے مثلاً

شیخ حسن علی تھانہ دار - ممکن ہے یہ مترجم کی جدت طبع کے نمونے ہوں - ملیح آبادی سے غالباً عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی کی طرف اشارہ ہے جو عربی کی کئی کتابوں کے ترجمے کر چکے ہیں - ملیح آباد میں اردو کے اور بھی ادیب ہیں اس لیے پورا نام نہ ہونے سے شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے —

بہر حال، جو لوگ انگریزی نہیں جانتے انہیں اس کتاب میں یورپ کے کاملین فن کا ایک ہلکا سا عکس مل سکتا ہے - ان داموں کتاب مہنگی بھی نہیں ہے —

" ناخدا "

لال قلعہ کی ایک جھلک

مصنفۂ - خواجہ ناصر نذیر فراق مرحوم دہلوی - کتابت و طباعت دیدہ زیب - حجم ۱۲۵ صفحات - قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتا - ساقی بک ڈپو، کھاری باؤلی دہلی -

فراق مرحوم دلی کی اس تہذیب و معاشرت کے آئینہ دار تھے جس کے خط و خال انقلاب زمانہ نے بالکل مسخ کردیے اور اب وہ باتیں خواب معلوم ہوتی ہیں۔ اِن کے بعد اب کوئی نہیں رہا جو اس خراب آباد کی یاد تازہ کرے - دلی کی زبان لکھنے میں فراق مرحوم کو ید طولی حاصل تھا اور یہ کتاب ان کے مخصوص طرز انشاء کا بہترین نمونہ ہے - دلی یہ کتاب شرر کے شاہ کار "گزشتہ لکھنؤ" کے جواب میں پیش کر سکتی ہے - شاہد احمد صاحب مدیر ساقی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی کاوش سے یہ مضامین لکھوائے اور مرتب کرکے کتابی صورت میں شائع کیے ورنہ یہ انمول موتی

یونہی بکھرے رہ جاتے - قدیم تمدن اور لطف زبان سے شغف رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ باعث مسرت ہوگا۔
"ناخدا"

حیات مسعودی

(نوشتۂ مولوی محمد عباس خاں صاحب شروانی - صفحات ۱۶۱ قیمت ایک روپیہ چار آنے)

سالار مسعود غازی (عرف بالے میاں) کا نام جس قدر مشہور اور زبان زد خلائق ہے اسی قدر ان کے اصل حالات و واقعات تاریکی میں ہیں - مولوی محمد عباس خاں صاحب شروانی نے جہاں تک ان کی دسترس تھی مختلف تاریخوں، کتبوں، زبانی روایتوں وغیرہ سے تحقیق کرکے ان کی تاریخ مرتب کی ہے - مسعود غازی کے حالات میں صرف ایک ہی کتاب مرأۃ مسعودی ہے، جس میں بہت کچھ مبالغہ ہے اور بہت سی ایسی باتیں درج ہیں جو ساقط الاعتبار ہیں- اگرچہ مولف کتاب ہذا نے اپنی تاریخ کی بہت کچھ بنیاد اسی پر رکھی ہے لیکن انہوں نے تحقیق و تلاش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا - ان تمام قدیم و جدید تاریخوں کا مطالعہ کیا ہے جن میں مسعود غازی کا ذرا سا بھی حوالہ تھا - بعض کتابیں جو دستیاب نہیں ہوئیں اور جن کا نام صرف دوسری تاریخوں میں ضمناً

آگیا ہے، اس میں مجبوری تھی - موجودہ حالات میں قابل مولف کی سعی و محنت لائق تحسین ہے —

تذکرۂ محسن

(مولفہ مولوی محمد امین صاحب زبیری - صفحات ۳۰۸ + ۲۵
قیمت غیر مجلد ایک روپیہ چار آنے، مجلد ایک روپیہ آٹھہ آنے) -

اس کتاب میں نواب محسن الملک سید مہدی علی مرحوم کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں- لکھنے والے مولوی محمد امین صاحب ہیں جن کو کچھہ دنوں نواب صاحب مرحوم کے ساتھہ رہنے کی عزت حاصل رہی ہے - اگرچہ محمد امین صاحب کے تعلق کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب کہ نواب صاحب حیدرآباد سے رخصت ہو کر بمبئی میں قیام فرما تھے - لیکن چونکہ خود محمد امین صاحب کو زمانۂ دراز تک ایک اسلامی ریاست سے تعلق رہا اس لیے وہ ریاستوں کے معاملات کو خوب سمجھتے ہیں اور انہیں حیدرآباد کے حالات و معاملات کے سمجھنے میں ذرہ بھی دقت نہیں - حیدرآباد کے بعد علی گڑھ کالج کا دور شروع ہوتا ہے اور یہیں اُن کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے - کالج کے حالات بھی لائق مولف نے بہت تحقیق سے جمع کیے ہیں یہ گویا اس وقت کے کالج کی صحیح تاریخ ہے —

اس سے قبل محمد امین صاحب نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرس کے لیے بھی نواب محسن الملک کی سوانح عمری لکھی تھی - لیکن اب کے انہیں اتفاق سے اور کچھہ نواب مسعود جنگ بہادر کی سعی سے نیا مسالا

ہاتھ لگا ہے جس سے یہ سیرت مکمل ہوگئی ہے - آخر میں بعض ضمیمے بھی اضافہ کیے گئے ہیں اور بعض انگریزی تحریریں اور خطوط جو اعلیٰ درجے کے انگریزوں نے خاص معاملات پر نواب صاحب کو لکھے تھے بجنسہ چھاپ دیے ہیں - ان میں لارڈ ڈفرن کا خط پڑھنے کے قابل ہے —

نواب صاحب میں بعض ظاہری اور باطنی ایسی خوبیاں تھیں جو اب شاذ و نادر پائی جاتی ہیں - چونکہ وہ مختلف حیثیتوں کے جامع تھے- اُن کا تعلق ملک اور خصوصاً مسلمانوں کی زندگی اور بہبودی سے تھا اس لیے اُن کی زندگی بہت ہی دلچسپ اور بصیرت افروز ہے- مولوی محمد امین صاحب نے اپنے اس فرض کو بڑی خوبی اور محنت سے انجام دیا ہے —

انقلاب فرانس

مصنفۂ باری صاحب - صفحات ۱۰۷ - قیمت درج نہیں - کتابت و طباعت اچھی - ملنے کا پتا - اردو بک اسٹال لوہاری گیٹ - لاہور —

انقلاب فرانس تاریخ عالم کا نہایت اہم واقعہ ہے اور سنہ ۱۷۸۹ ع عصر جدید کی آفرینش کی تاریخ کہی جاسکتی ہے - آج دنیا میں مساوات، اخوت اور آزادی کے جو پرچم لہرا رہے ہیں اس کی ابتدا اول اول وہیں سے ہوئی - زیر نظر کتاب میں مصنف نے پہلے تو نشاۃ ثانیہ سے لے کر لوئی پانزدہم کے عہد حکومت تک کا ایک سرسری سا جائزہ لیا ہے - بعد از آں استبداد کا خاکہ پیش کرکے امکانات انقلاب پر بحث کی ہے - اس ضمن میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہوگا صحیح ہو یا غلط لیکن ہم ان کی انقلاب کی تعریف کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ وہ بادی النظر میں انقلاب

اور بغاوت میں کوئی امتیاز نہیں سمجھتے درآں حالیکہ ان دونوں میں بعد مشرقین ہے - کروپاٹکن اپنی تاریخ انقلاب فرانس میں اس تاریخی روش (Process) کی یوں تشریح کرتا ہے : شہروں اور دیہاتوں کی بہتیری بغاوتوں سے بھی انقلاب کا دائرہ کہیں زیادہ وسیع ہے- وہ خوفناک سے خوفناک جماعتی لڑائیوں یا حکومت کی تبدیلیوں سے زیادہ دور رس ہے - انقلاب نام ہے چشم زدن میں ان اداروں کے نیست و نابود ہوجانے کا جو صدیوں سے قائم تھے اور جن کی بنیادوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بڑے بڑے سورما رفارمر بھی لرزتے تھے - انقلاب نام ہے اس عہد کے سیاسی' اقتصادی اور سماجی ایوانوں کے زمین دوز ہوجانے کا - انقلاب تعلقات انسانی اور سماجی اداروں کی قدیم بنیادوں کو تہس نہس کر کے نظام زندگی کا ایک نیا ڈھانچا کھڑا کرتا ہے - پھر اس کے اصول رفتہ رفتہ دنیا میں پھیلتے جاتے اور آنے والی نسلوں کے لیے تمدنی' اقتصادی اور سیاسی ترقی کی نئی شاہراہیں کھول دیتے ہیں - اس لحاظ سے انقلاب فرانس کی نوعیت بالکل مختلف ہے ---

مصنف یہ بتلانے میں کامیاب ہوے ہیں کہ انقلاب کی تحریک کس ماحول میں نشو و نما پارہی تھی - لیکن انقلاب کی قیادت کن ہاتھوں میں تھی اس کے سپاہی کون تھے' اس کے مطالبات کیا تھے' اور وہ کیوں نہ پورے ہوے - ان اہم سوالات کا جواب اس کتاب میں ملے گا ---

یہ فرانس کا سرمایہ دارانہ جمہوری انقلاب - (Bourgeois democratic Revolution) تھا - یعنی یہ سامنتی شکنجوں سے آزاد ہونے کے لیے حرفتی سرمایہ داری کی کامیاب سعی تھی - ہر حکومت کا دارومدار کسی خاص طبقے کے اقتصادی مفاد پر ہوتا ہے اور اس کے استوار ہونے کی ضمانت اس طبقے کے فروغ پر ہے - جب کوئی نیا طبقہ اپنے تاریخی فرایض کو پورا کرنا

چاہتا ہے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ حکومت وقت کو ایسی تشکیل دے کہ وہ اس کے ارادوں میں ہارج نہ ہو - فرانس میں مشینوں کے رواج اور دور حرفت کے آغاز کے بعد یہ ناگزیر تھا کہ فرسودہ نظام حکومت بدل جاے تاکہ اس کی پیش پا افتادہ پابندیاں متوسط طبقے کی راہ میں حایل نہ ہوں - اس مہم میں وہ صرف اس وقت فتحیاب ہوتا ہے جب کہ عوام اس کے دوش بدوش استبداد سے لڑیں - جب ان کی امداد سے متوسط طبقے نے سامنہت سے نجات حاصل کی تو مساوات 'اخوت اور آزادی کے معنے بدل گئے - پھر سرمایہ داروں میں ان ارکان ثلاثہ کے مطلب یہ سمجھے جانے لگے کہ آزادی ہو مگر ظلم کرنے کی- اخوت ہو لیکن صرف ظالموں میں - اور مساوات ضرور ہولیکن عالم بالا میں- لیکن یہ بھی ایک ناگزیر نشان راہ تھا کیونکہ اس زمانے میں وہ شترا کی انقلاب ممکن ہی نہ تھا جس کے سرگرم موئید باری صاحب معلوم ہوتے ہیں- مارکس اور لینن نے اپنی کتابوں میں جابجا اور خصوصاً ''پیرس کمیون'' میں اس کا اعتراف کیا ہے ــــ

بہر حال یہ مسئلہ ایک بسیط مقالہ کا حاجت مند ہے اور ہم صرف یہ کہہ کر اکتفا کرتے ہیں کہ اس کتاب کے حدود کو دیکھتے ہوے اس میں معلومات کا نہیں تو دلچسپی کا کافی مواد موجود ہے- طرز تحریر خطیبانہ ہوتے ہوے بھی دلکش ہے - کتابیات میں حسب ذیل کتابوں کا اندراج ضروری تھا ــــ

(۱) انقلاب فرانس از ہالینڈ روز (۲) انقلاب فرانس از میڈلن (۳) انقلاب فرانس از مالیت (۴) انقلاب فرانس از کروپاٹکن (۵) انقلاب فرانس میشلے (۶) انقلاب فرانس از اولارد (۷) انقلاب فرانس از کارلائیل ــــ

"ناخدا"

متفرقات

اردو پرائمری مدارس صوبۂ متوسط و برار کا درسی سلسلہ

(عطر چند کپور اینڈ سنز بک سلیرز اینڈ پبلشرز لاهور)

اس سلسلے میں اردو کا قاعدہ اور پہلی چار کتابیں شامل هیں - یہ سب کتابیں عمدہ کاغذ پر بہت اچھی چھپی هیں - قاعدے میں ابھی اصلاح کی بہت کچھہ گنجائش ہے - موجودہ صورت میں بچوں کے لیے کوئی سہولت نہیں پائی جاتی - اعراب کے لگانے میں بھی کوئی خاص اصول مدنظر نہیں رکھا گیا -

باقی چار کتابیں تعلیمی اور ادبی لحاظ سے بہت مناسب اور معقول هیں - زبان ایسی رکھی گئی ہے جو اس صوبے کے بچوں کے لیے غیر مانوس نہیں - بعض اسباق ایسے داخل کیے گئے هیں جن کا تعلق خاص صوبۂ برار سے ہے اور یہ اس سلسلے کے لیے ضروری تھا - علاوہ ادبی اور اخلاقی مضامین کے عام معلومات کے مضامین بھی کافی تعداد میں هیں - موقع موقع سے عکسی اور رنگین تصویریں بھی دی گئی هیں - خاں صاحب خواجہ لطیف احمد صاحب بی - اے نے جن کی تمام عمر تعلیم و تعلم میں گزری ہے، اس سلسلے کو مرتب کیا ہے - اس کی ترتیب و تالیف میں خواجہ صاحب نے بڑے سلیقے سے کام لیا ہے —

اُردُو کے جدید رسالے

انیس

(اڈیٹر شرار بی - اے صاحب - سالانہ قیمت - دو روپے آٹھہ آنے - ایلچ پور ، برار)

یہ ماہانہ رسالہ ایلچ پور برار سے شایع ہوتا ہے - مضامین مختلف قسم کے اور دلچسپ ہوتے ہیں - اس علاقے میں ایک ایسے رسالے کی بہت ضرورت تھی - اہل برار کو اس اردو رسالے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے ، وہاں ابھی اردو کا چرچا ہے اور اس کی ترقی اور اشاعت کے لیے ہر طرح کی سعی درکار ہے —

صبح امید

(اڈیٹر مدن گوپال متل صاحب بی - اے - سالانہ قیمت تین روپے - مقام لدھیانہ)

یہ ماہانہ رسالہ جو ابھی لدھیانہ سے نکلنا شروع ہوا ہے ، ہونہار معلوم ہوتا ہے - سرورق پر "علمی ادبی اور تعلیمی" رسالہ لکھا ہے اور اس مقصد کے نباہنے کے لیے قابل اڈیٹر نے مفید اور دلچسپ دونوں قسم کے مضامین جمع کیے ہیں —

اوراق علیگیرین

(ایڈیٹر سعید محمد خاں صاحب بھوپالی - کراؤن سایز اردو کے ۴ اور انگریزی کے ۴ صفحات - کاغذ طباعت و کتابت اچھی - سالانہ قیمت - ۱۲ روپے)

سعید محمد خاں صاحب پہلے بھی یہ اخبار نکالتے تھے اور اب علی گڑھ اور وہاں کی جمعیت کی خدمت کے ارادے سے از سر نو اس کی اشاعت شروع کی ہے - پیش نظر نمبر اس جریدہ کا (experimental) یعنی تجرباتی نمبر ہے گویا یہ ایک 'محاس' ہے جس سے یہ معلوم کرنا مقصود ہے کہ اتنے خریدار فراہم ہوتے ہیں یا نہیں جو اسے کفیل بالذات بنا دیں - اگر ایسا ہوا تو فبہا ورنہ احتمال اس کا ہے کہ ایک " Longing tearfuladieu " 'پر حسرت اور اشک فشاں الوداع' کے ساتھ وہ ہم سے رخصت ہو جاے گا - تاہم وہ اخباری برادری کے لیے ایک نیا پیمانہ چھوڑ جاے گا جس کے ذریعے وہ اپنی مختصر سی تھیلی کا جائزہ لے سکے گی —

اگر اخبار کا معیار آئندہ بھی وہی رہے گا جو اس نمبر کا ہے تو ہم ابھی سے مایوس ہو چکے - اداریہ کی انگریزی میں پوپ اور ڈرائیڈن کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے - یہ برا نہیں ہے کہ جہاں اردو میں اب بھی طلسم ہوش ربا اور فسانۂ عجائب کی پیروی کرنے والے حضرات موجود ہیں کیوں نہ انگریزی کا وہ دور زندہ کیا جاے جب ایک ایک جملے میں سو سو بل اور ہر ہر بل میں ہزاروں پیچ ہوتے تھے —

انگریزی کے چار صفحات میں سے ڈیڑھ صفحہ اُن شقوں کے لیے وقف ہے جو بعض حکام نے ایڈیٹر صاحب کے خطوط کے جواب میں ارسال کی تھیں - یہ علی گڑھ کی سنت دیرینہ ہے جس کے متعلق کچھ کہنا سوے ادب سمجھا جاے گا —

شعبۂ اردو ایک قصیدہ سے شروع ہوتا ہے جو نواب صاحب بھوپال کی تعریف میں ہے - پھر کچھ خطوط اور 'کھلنڈرے پن' کی باتیں ہیں - ایک دو رخی تصویر ہے جس میں سے ایک طرف کچھ نظام علیگ صاحبان کا گروپ ہے اور دوسری طرف ایک کارٹون ہے —

اگر واقعتاً یہ جریدہ علی گڑہ کی اصلاح کے لیے نکالا گیا ہے تو اس کا پیرایہ زیادہ متین اور سنجیدہ ہونا چاہیے - اسے ان بنیادی مسائل کو پیش کرنا چاہیے جن پر علی گڑہ کی موجودہ ممات اور آئندہ حیات کا دار و مدار ہے -

(نا خدا)

ہمایوں کا روسی ادب نمبر

مئی سنہ ۳۵ ع - مرتبہ بشیر احمد صاحب بی - اے (آکسن)

حجم - معمولی نمبروں سے کچھہ زیادہ —

روسی ادب سے ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقے کی روز افزوں دلچسپی اس ذہنیت کا پرتو ہے جو نظام زندگی کے انتشار کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے - بے کاری اور افلاس کی گراں باری ادب کو رومانی فضا سے نکال کر حقیقت نگاری کی طرف آنے کے لیے مجبور کر رہی ہے —

اس لیے جب ہم نے سنا کہ پنجاب کا ممتاز ماہ نامہ 'ہمایوں' ایک روسی ادب نمبر نکال رہا ہے تو ہمیں خوشی ہوئی اور ہم اس کی اشاعت کے منتظر رہے - لیکن یہ دیکھہ کر مایوسی ہوئی کہ ادارہ نے اس کی ترتیب میں کاوش سے کام نہیں لیا - ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں

کہ پورے روسی ادب کا احاطہ ایک آدہ سو صفحات کے رسالے میں کیسے کیا جا سکتا ہے۔ طالسطائی، دستوویسکی، گورکی یا کسی بھی قابل ذکر ادیب کے تعارف کے لیے اتنا بڑا نمبر مشکل سے کافی ہوتا۔ چاہیے یہ تھا کہ روسی ادب کے ہر دور کا ایک مختصر سا تجزیہ پیش کیا جاتا اور ہمیں یقین تھا کہ پیش نظر رسالہ میں کم از کم دور قدیم اور دور جدید پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہوگی۔ لیکن یہ دیکھہ کر حیرت ہوئی کہ روسی ادب پر کوئی تنقیدی مضمون نہیں ہے اور جو ایک 'طائرانہ نگاہ' ہے بھی تو اس کی حیثیت ادیبوں کی پیدائش اور موت کی تاریخوں کے گوشوارہ سے زیادہ نہیں! پھر یہ سمجھہ میں نہ آیا کہ اس ادبی نمبر میں 'بولشویک روس کا پس منظر' 'لینن خدا کے حضور میں' اور 'روسی تاریخ کے مشہور سنین' کی اشاعت کا کیا موقع و محل تھا، بنا بریں، بولشیوک روس کا پس منظر جس مطالعے اور تحقیق کا محتاج ہوگا اس مضمون کے احاطے سے باہر ہے —

یہ بھی سمجھہ میں نہ آیا کہ یہ نمبر پورے روسی ادب کے لیے وقف ہے یا جدید روسی ادب کے لیے۔ اگر کلاسک ادب کی مثالیں دینا منظور تھیں تو دستوویسکی یا پیشکن کو کیوں کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر طرز جدید کو نمایاں کرنا تھا تو گورکی، رومینداف، بیبل یا ایرن برگ کو کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے مثالوں کے انتخاب میں بھی خوش ذوقی سے کام نہیں لیا گیا —

مختصر یہ کہ اس نمبر کی ترتیب جلدی میں کی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کل ترجمے قلم برداشتہ ہوئے ہیں اور وہ بھی ایک ہی قلم سے۔ اس قلم کی گل فشانی ملاحظہ ہو:

"جنگ کی ستم آفرینیوں کی یاد'

اور اس کے ہر ایک صید بسمل کا تصور'

وابستہ کردیتا ہے میرا رشتۂ ہمدردی'

مرتے ہوے نوجوان دوست اور پیاری بیوی سے زیادہ اہم ہستی کے ساتھہ"۔

ایک تو ترجمہ در ترجمہ اور پھر یہ الجھی ہوئی تحریر — ستم بالاے ستم ہے —

رسالے کے آخر میں ایک دلچسپ فروگزاشت ملے گی - ایک نظم اور ایک اشتہار ساتھہ ساتھہ چھپے ہیں — جن میں سے نظم کا عنوان ہے 'عشق انوکھی ریت ہے پیارے' جواب برآمد 'صرف پاپیوں کے لیے'! مضامین اور اشتہارات ایک صفحے پر نہ چھاپے جائیں تو اچھا ہو —

اُمید ہے کہ ادارۂ ہمایوں اپنے آئندہ فرانسیسی ادب نمبر میں ایسی خامیوں کا اعادہ نہ ہونے دے گا —

"ناخدا"

سائنس

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہونگے، ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے - ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے - اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے —

رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں —

سالانہ چندہ سات روپے سکۂ انگریزی (آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) نمونہ کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے سکۂ انگریزی (یا دو روپے سکۂ عثمانیہ) -- طلباء کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ یہ رسالہ بہ تصدیق پرنسپل صاحب (یا ہیڈ ماسٹر صاحب) انہیں پانچ روپے چار آنے سکۂ انگریزی (چھ روپے سکۂ عثمانیہ) سالانہ چندہ میں دیا جاتا ہے --

اُمید ہے کہ اُردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے —

VOL. 15 JULY 1935 No. 59

The Urdu

The Quarterly Journal

OF

The Anjuman-i-Taraqqi-e-Urdu

EDITED BY

Abdul Haq, B. A., (Alig.)

HONORARY SECRETARY

Anjuman - i - Taraqqi - e - Urdu, Aurangabad, (Deccan).